Phone 880808

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1983

اس پرچہ میں

قانونِ شہادت

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ ″	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۶	مارچ ۱۹۸۳ء	شمارہ ۳

فہرست

۱ - لمعات ———— ۳
۲ - قرآنی درس کے اعلانات ———— ۸
۳ - اسلام کا سیاسی نظام (عہدِ فاروقی میں) ———— ۹
۴ - شاہکارِ رسالت (عمر فاروقؓ) ———— ۴۴
۵ - بابِ المراسلات - قانونِ شہادت ———— ۴۵
۶ - سلسلہ مطالب الفرقان - (قرآن کی بصیرت افروز تفسیر) ———— ۴۸
۷ - اسلام — دورِ ملوکیت میں لہو و لعب کی زندگی ———— ۴۹
۸ - قرآنی فیصلے - (جلد پنجم) ———— ۶۳

ایڈیٹر: محمد خلیل ، ناشر: شیخ عبدالحمید ۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی ، گلبرگ ۲ ، لاہور ۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۵ ایبک روڈ لاہور

باسمہ تعالیٰ

لمعات

یہاں بیں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے!

یہ ہمارا مبنی بر ایمان دعوےٰ (اور ساری دنیا کو چیلنج) ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانی زندگی سے متعلق جو اصول و اقدار عطا کئے ہیں، ان کی مثال اور نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ نہ دُنیا کے مذاہب میں اور نہ ہی لامذہبی (سیکولرازم) کے نظام میں۔ انسانی زندگی کے متعدد گوشے ہیں اور متنوع تقاضے لیکن ان میں سب سے اہم انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ ہے جسے (عام طور پر) نظامِ مملکت یا اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔ اس باب میں اس نے سب سے پہلے یہ اصول دیا کہ

(۱) کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر حقِ حکومت حاصل نہیں۔

اس کا ارشاد ہے:-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خواہ خدا اسے ضابطۂ قوانین یا فیصلے کرنے کا اختیار اور خواہ نبوت بھی کیوں نہ عطا کر دے۔ کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔

آپ ساری تاریخِ انسانیت چھان ڈالیے۔ آپ کو کہیں یہ تصور نہیں ملے گا کہ انسانوں کے بغیر حکومت ممکن ہے جہاں کہیں بھی حکومت ہوگی، انسان اس کے ساتھ شامل ہوں گے، خواہ ان کی اس شمولیت کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

انسانوں کے حقِ حکومت کو اس طرح باطل قرار دینے کے بعد اس نے کہا کہ

(۲) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) اس کا واضح ارشاد ہے یعنی حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس کے اس حق میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۲۶) اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ

(إِيَّاهُ (۱۲/۴۰) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ (۱۲/۴۰) ۔ یہی محکم نظامِ حیات ۔ دینِ قیّم ہے ۔ اسی کو توحید کہتے ہیں ۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں اور وہ انسانی حکومتوں کی شکل (F O R M) بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے صحیح نظامِ حکومت قائم کر لیا ہے ۔

عیسائیت میں " آسمانی حکومت " کے الفاظ ملتے ہیں لیکن انہوں نے اس کے صحیح مفہوم کو اس طرح مسخ کر دیا کہ اقوامِ مغرب نے اپنے نظامِ حکومت سے مذہب کو سرے سے خارج ہی کر دیا اور سیکولر نظام قائم کر لیا ۔ وہاں کے کلیسا (مذہبی پیشوائیت) نے کہا تھا کہ حقِ حکومت خدا ہی کو حاصل ہے لیکن خدا اپنے اس حق کو اپنے نمائندگان کو تفویض کر دیتا ہے ۔ اس نے ہماری حکومت ، انسانوں کی حکومت نہیں ۔ خدا ہی کی حکومت ہے ۔ اسے تھیاکریسی کہتے ہیں جو ملوکیت سے بھی بدتر نظام ہے ۔ ملوکیت کے خلاف تو بغاوت بھی کی جا سکتی ہے جس کی نوعیت بہرحال سیاسی کبھی جاتی ہے ۔ لیکن خدا کے ان (خود ساختہ) نمائندگان کے خلاف لب کشائی تک بھی کفر و ارتداد قرار پا جاتا تھا جس کی سزا آتشِ دار تھی ۔ اقوامِ مغرب نے اس نظام کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر مذہب کا لبادہ اتار پھینکا

لیکن قرآن نے جب کہا کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے تو اس نے اسے مبہم نہیں رہنے دیا (جس سے خدائی فوجداروں کو خدا کے نام پر ، اپنی من مانی کرنے کی گنجائش نکل آئے) ۔ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ خدا کی حکومت سے مراد اس کی کتاب کی حکمرانی ہے ۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خود زبانِ نبوّت سے کہلوایا گیا کہ أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ٥ (۶/۱۱۴) " کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کروں حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کر دیتی ہے " اس سے اس نے (علاوہ ایک اور انفرادیت کے) ۔ انسانوں کی جگہ قانون کی حکمرانی (RULE OF THE LAW) کا نظریہ بھی دے دیا ۔ اور اس سے کسی کو بھی مستثنٰے قرار نہ دیا ۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ سے بھی کہہ دیا کہ وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۹) ۔ ان کے معاملات کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کرو ۔

" قانون کی حکمرانی " کے نظریہ کی رُو سے ، قانون سازی کا حق بہرحال انسانوں کو حاصل رہتا ہے ۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو اس طرزِ حکومت میں حکومت کا حق پھر انسانوں کو حاصل ہو جاتا ہے ، کیونکہ قوانین بہرحال انسانوں ہی نے بنانے ہوتے ہیں ۔ اس اندازِ حکومت کو جمہوریت کہا جاتا ہے ۔ جو قرآن کی رُو سے ایسی ہی مردود ہے جیسی شخصی حکومت یا ملوکیت ، کیونکہ قانون سازی کا حق ایک انسان کو حاصل ہو یا انسانوں کی کسی جماعت کو ، انسان کی حکومت بہر نوع قائم رہتی ہے ۔ اس باب میں قرآن کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے حقِ حکومت ان قوانین کو دیا ہے جو خود خدا کے متعین کردہ ہیں ۔ یہ قوانین (قرآن کے اندر ہیں اور) مکمل اور غیر متبدل ۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ٥ (۶/۱۱۵) " قوانینِ خداوندی صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے ۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا " ۔ کتابِ خداوندی کے مطابق نظامِ حکومت کو اسلامی حکومت کہا جاتا ہے اور یہی کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز ہے ۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا جس نظامِ حکومت میں حکمرانی خالصتہً (لاشریک) کتاب اللہ کی نہیں، اسے اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کے الفاظ میں وہ کافرانہ نظامِ حکومت ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران یہی بنیادی نکتہ مابہ النزاع تھا نیشنلسٹ علماء کے سرخیل (دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ سے کہا تھا کہ جب آپ بھی آزادی حاصل کرنے کے دعویدار ہیں اور کانگریس کا بھی یہی مطالبہ ہے تو آپ ان کے ساتھ مل کر حصولِ آزادی کے لئے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟" انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) اس کے جواب میں جو کچھ کہا تھا وہ قرآنِ مجید کے احکام کی تشریح تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا:-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اولیں مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان کو تقویت میسر آئے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پہ ہوں جن پہ انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پہ ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا۔ لاٹھیاں کھانا۔ جیل جانا۔ گولی کا نشانہ بننا سب حرام سمجھتا ہوں۔ حرام!

بالفاظ دیگر جس حکومت میں خدا کی کتاب کی حکمرانی نہیں، وہ حکومت کافرانہ ہے، خواہ وہ کسی کی بھی کیوں نہ ہو۔ اسلامی حکومت کا منصب، فریضہ اور ذمہ داری (کتاب اللہ کے اصول و احکام کو عملاً نافذ کرنا ہے۔ اس حکومت کے لئے اس کی اصطلاح بھی اپنی ہے یعنی اِسْتِخْلَافٌ فِی الْاَرْضِ جسے مخففاً خلافت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ قرآن کی اگلی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو بھی کسی فرد کے سپرد نہیں کرتا بلکہ پوری کی پوری اُمت (جماعتِ مومنین) کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)۔ جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو تسلیم کریں گے اور ان کے اعمال اس کے مقرر کردہ پیمانے پہ پورے اتریں گے تو انہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا۔ یہ خدا کا وعدہ، یعنی اس کا غیر متبدل قانون ہے۔ یعنی یہ استخلاف بھی اشخاص کے بجائے امت کے حصے میں آئے گا۔ اور اس کا مقصد ہوگا۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (۲۴/۵۵) تاکہ اس سے اس دین (نظامِ حیات) کو تمکن حاصل ہو جائے جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے۔ یہ مقصد "اَمْر بِالْمَعْرُوْف اور نَہْی عَنِ الْمُنْكَر" کے ذریعے حاصل ہوگا۔ قرآن کریم نے اسے بھی پوری کی پوری امت کا فریضہ قرار دیا ہے۔ امت کے کسی خاص شخص کا تو ایک طرف کسی خاص گروہ کا بھی نہیں۔ اس نے جماعت مومنین

کے متعلق فرمایا۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود و منفعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ اَمر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ دوسری جگہ ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ان کا فریضہ ہوگا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کا منصب۔ یہی جماعت مومنین سے کہا اور یہی نبی اکرمؐ کے متعلق ([illegible])۔

اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے جملہ امور کے فیصلے امت کی باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پائیں گے"۔ نظامِ حکومت کے لئے کسی مرکزی اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جسے (موجودہ دور میں) سربراہِ مملکت کہا جاتا ہے۔ یہ امت، اس منصب کے لئے باہمی مشاورت سے اس شخص کو منتخب کرے گی جو ان میں سب سے زیادہ اکرم اور اتقیٰ ہوگا (۴۹/۱۳)۔ قرآن کی یہ اصطلاحات بڑی جامع ہیں جن کا ترجمہ ایک لفظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ قرآنِ کریم نے مومن کی جو خصوصیات شرح و بسط سے بیان کی ہیں، ان کا بہترین حامل۔ اُن کا کُل سرسبد۔

ان تشریحات سے واضح ہے کہ

(۱) قرآنِ کریم کی رُو سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے حقِ حکومت حاصل ہے۔ یا خدا نے اسے اس منصب کے لئے مامور کیا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ اسلامی مملکت کے سب سے پہلے سربراہ تھے۔ لیکن ان کی یہ سربراہی رسول ہونے کی حیثیت سے تھی اس لئے وہ تو ایسا کہنے میں حق بجانب تھے کہ انہیں اس منصب کے لئے خدا نے مامور کیا ہے۔ نبوت حضورؐ پر ختم ہو گئی۔ اس لئے حضورؐ کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے اس منصب پر خدا نے فائز کیا ہے اور ان ذمہ داریوں کی سرانجام دہی کے لئے وہ مامور من اللہ ہے۔ ایسا کہنا یا تو دعوٰئے نبوت کے مترادف ہے، یا تھیا کریسی، جو (دونوں) اسلام کی نقیض ہیں۔ اسلام کی رُو سے وہ نہ سلطان زمین پر خدا کا سایہ (ظل اللہ علی الارض) ہوتا ہے، نہ خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا حامل۔ وہ دیگر افرادِ امت جیسا امت کا ایک فرد ہوتا ہے۔ استخلاف پوری کی پوری امت کے لئے ہے۔ اور جس شخص کو امت اپنے میں سے منتخب کر لے، وہ اس مملکت کا سربراہ ہو سکتا ہے اور اس وقت تک سربراہ رہ سکتا ہے جب تک اسے امت کی تصویب (رضامندی) حاصل رہے۔ خدا نہ کسی کو مقرر کرتا ہے، نہ برطرف کرتا۔

دوسرے یہ کہ اس انتخاب کے لئے قرآنِ کریم نے شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کو شرط قرار دیا ہے۔ بَيْنَهُمْ کی ضمیر اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس میں پوری کی پوری امت شامل ہوگی۔ نہ کہ امت کا کوئی خاص گروہ۔ اس کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس کا فیصلہ بھی امت باہمی مشاورت سے کرے گی۔

اگلی شق جس کی رُو سے یہ نظام دیگر نظام ہائے عالم میں یکتا ہے، غور طلب ہے۔ دنیا میں جہاں بھی مذہب کا نام لیا جائے گا، مذہبی پیشوائیت اس کے ساتھ وابستہ ہوگی۔ اسلامی مملکت (یا اسلامی معاشرہ) سطحی طور

پر مذہبی ریاست یا مذہبی معاشرہ ہی متصور ہوگا۔ لیکن دنیا کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اس میں مذہبی پیشوائیت کا تصور تک نہیں ہوگا۔ قرآن اس (INSTITUTION) کو شرک قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو دیکھو۔ وہ خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کے ساتھ مذہبی پیشواؤں کو بھی۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)۔

انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا سے وَرے ہی خدا بنا رکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضور نبی اکرمؐ کا ارشادِ گرامی بڑا حقیقت کشا ہے:۔

> حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دیکھ کر فرمایا۔ عدی! اس بت کو گلے سے اُتار پھینک۔ اُس وقت آپؐ سورۂ توبہ کی (مندرجہ بالا) آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے اسے یہ لوگ تمہارے لئے حلال کر دیتے ہیں اور تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو۔ اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے اسے یہ لوگ حرام کر دیتے ہیں، اور تم اسے حرام سمجھنے لگ جاتے ہو۔ میں نے اقرار کیا کہ بے شک واقعہ یہی ہے۔ تو فرمایا۔ یہی تو انہیں خدا بنا لینا ہے۔ (جامع بیان العلم۔ ابن عبد البر)۔

بات بالکل واضح ہے۔ قانون سازی کا حق تو صرف خدا کے لئے مخصوص ہے۔ انسانوں کو اس کا حق دے دینا انہیں خدا کا ہمسر بنا لینا نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر جب عہدِ گذشتہ کے احبار و رہبان (فقہا) کا معاملہ ہو تو سوال اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ سوچیے کہ ہزار سال پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ہم غیر متبدل قرار دے کر (انہیں) اسلامی شریعت کے طور پر نافذ کر دیں تو کیا یہ (ایک اور جہت سے بھی) خدا کے شریک و سہیم بن جانے کے مرادف نہیں ہوگا؟ خدا نے غیر متبدل صرف اپنے قوانین کو قرار دیا ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو اس خصوصیت میں شریک کر لینا شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ وہ اسلاف کی اطاعت (تقلید) ہے جس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اپنے اسلاف کے راستے پر ہی چلتے رہیں گے"۔ یعنی جب قرآن اور فقہائے سلف کے وضع کردہ قوانین کا تقابل ہوتا ہے تو یہ اسلاف کے قوانین کو قرآن پر ترجیح دیتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

اس کا لازمی نتیجہ فرقہ بندی ہے جسے قرآن نے بہ نصِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۲)۔ ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ ہوتی ہے جسے وہ کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ قرآن نے تمام مسلمانوں کو ایک اُمّت (امت واحدہ) بنایا تھا۔ فقہ نے انہیں فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کوئی ایسا قانون بنا نہیں سکتے جس کا اطلاق (تمام فرقوں کے) مسلمانوں پر یکساں ہو سکے! کیا دنیا میں کوئی ایسی مملکت بھی نظر آتی ہے جس میں پبلک لاز مختلف گروہوں کے لئے الگ الگ ہوں؟

انہوں نے قوانین کو بھی دو شقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پرسنل لاز اور پبلک لاز۔ قرآن کریم میں اس تقسیم و تفریق کا تصور تک نہیں ملتا۔ اس کے تمام قوانین "پبلک لاز" ہیں جن کا تمام مسلمانوں پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔

لہٰذا جس مملکت میں مختلف فرقے ہوں اور پرسنل اور پرائیوٹ لاز الگ الگ وہ مملکت اسلامی بن کیسے سکتی ہے؟

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اسلامی مملکت میں قرآن کے اصول و اقدار غیر متبدل ہوں گے۔ ان میں نہ تغیر و تبدل ہوگا، نہ حک و اضافہ۔ مملکت کا فریضہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصول و اقدار و احکام کو نافذ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اس کا فیصلہ امت کی منتخب کردہ مجلس مشاورت (اسے آج کی اصطلاح میں پارلیمان کہہ لیجئے) کرے گی۔ اس کے لئے اُن اٹھارہ علوم کی قطعاً ضرورت نہیں ہوگی جنہیں حاصل کرنے کے بعد بیچارہ طالب علم نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔ دین کا اس لئے کہ ان کے نصاب میں قرآن محض تبرکاً شامل ہوتا ہے۔ اور دنیا کا اس لئے کہ وہ ایک وقت کی روٹی کمانے کے بھی قابل نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لئے ضرورت اتنی ہوگی کہ قرآن کریم پر گہری نگاہ ہو اور اپنے زمانے کے تقاضوں اور تحریکوں کا علم ہو۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو جزئی قوانین مرتب کئے جائینگے انہیں احکام شریعت کہا جائے گا۔ یہ جامد نہیں ہوں گے بمقتضیات زمانہ کے ساتھ ساتھ قابل تغیر و تبدل ہوں گے۔ شریعت تو کہتے ہی اس راستے کو ہیں جو اُس ندی کی طرف جائے جو رواں ہو۔

طلوع اسلام نہ عملی سیاست میں حصہ لیتا ہے۔ نہ اسے اقتدار سے کسی قسم کا سروکار ہے۔ اسے حق ہے تو اس بات کا کہ جو بات قرآنی نقطۂ نگاہ سے اسلامی نہیں قرار پا سکتی، اسے اسلامی قرار دیا جاتا ہے۔ جو حضرات، بالواسطہ یا بلاواسطہ، کسی جہت سے بھی اس سے وابستہ ہوں، ہم ان کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سوچیں کہ وہ کس قدر عظیم ذمہ داری اپنے سر پر لے رہے ہیں، اور کل کو خدا کے حضور اس کا کیا جواب دیں گے۔ جو لاکھوں، کروڑوں مسلمان، ان غیر قرآنی مسالک و قوانین کو اسلامی سمجھ کر اختیار کریں گے، ان کے گناہوں کا بوجھ کس کی گردن پر ہوگا؟ وہ سوچیں کہ کہیں (خدانخواستہ) ان کا شمار ان لوگوں میں تو نہیں ہوگا جن کے متعلق ارشاد خداوندی ہے کہ لِيَحْمِلُوٓا۟ أَوْزَارَهُمْ (۱۶/۲۵) جو اپنے اعمال کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے اعمال میں سے بھی کچھ بوجھ جنہیں یہ اس طرح بہکانے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ سوچیں کہ جب بروز حشر حضور نبی اکرمؐ خدا سے فریاد کریں گے کہ يَٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِى ٱتَّخَذُوا۟ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ مَهْجُورًا (۲۵/۳۰) اے میرے پروردگار! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا، تو حضورؐ کی انگلی آپکی طرف تو نہیں اٹھے گی؟ سوچئے کہ یہ باتیں گہری سوچ کی متقاضی ہیں۔ انکا تعلق محض دنیاوی حکمرانی سے نہیں، اُخروی مؤاخذہ سے بھی ہے۔ حضورؐ کی فریاد یہ نہیں ہوگی کہ انہوں نے فقہ اور حدیث اور اسلاف کے مسلک کو چھوڑ دیا تھا۔ فریاد یہ ہوگی کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ اس مؤاخذہ سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ جس حکومت، قانون یا شریعت کو آپ "اسلامی" کہتے ہیں اسکے اسلامی ہونے کی قرآنی سند آپکے پاس ہے؟ اسکے لئے کسی امام کسی محدث کسی فقیہہ کسی مفسر کسی عالم کسی نظریاتی کونسل کسی مجلس شوریٰ کا قول یا فیصلہ بارگاہِ خداوندی میں قابلِ قبول سند قرار نہیں پائیگا۔ خدا کے حضور سند صرف خدا کی کتاب ہوگی۔ یہ ہے طلوع اسلام کا پیغام اور التزام!

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

شبت مقامی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزم طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف :-	نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی مستند کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں سے ریکارڈ کرائے جا سکتے ہیں -
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۷۰۸۰۰	
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896	
برمنگھم (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر (بمقام)		227/229 ALUMROCK ROAD 38 38H,	
اوسلو (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اتوار یا سنیچر شام ۶ بجے (بمقام)		MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1	
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۱ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827	
کراچی صدر	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	بذریعہ C.R بی۔ دار لنٹر یرہ (بالائی منزل) بالمقابل شاپ بس نمبر ۲ - مسجد روڈ	
پشاور	۱۔ ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲۔ ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب - رفیق بن صدر (OPP: VIP. MAINGATE) پشاور سیکرٹریٹ ہوٹل نعمت کدہ - یونیورسٹی روڈ - جہانگیر آباد -	باڑہ روڈ فون ۴۲۴۵۹
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبد اللطیف - محمود علی صاحب - انگا جیل بلڈنگ نواب علی روڈ	
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۶۶ ، بانت روڈ	
بنوں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینیرنگ ورکس - شہید روڈ [illegible]	
ایبٹ آباد	ہر جمعہ [illegible] بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب - واقع 234-K-L [illegible] ایبٹ آباد)	
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک دائرہ سپلائی ۳ مکان نمبر ۴ - نظامی منزل	
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ بختی پور باہتمام (ڈاکٹر) حویرہ محمد اعظم [illegible]	
چکوال	ہر جمعہ ۵ بجے صبح	میاں ٹیوشن سنٹر نزد مجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب [illegible] اسلام	
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ - باہتمام غلام [illegible] صاحب	
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ، ملحق رہائش [illegible] چوہدری مقبول شوکت - [illegible] روڈ - سول [illegible]	
گجرات - ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر بمقام [illegible] روڈ ..... باہتمام شیخ [illegible] اللہ صاحب [illegible]			
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع [illegible] بازار کلاں	
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر شاہ [illegible] بیرون پاک گیٹ (فون : [illegible])	
مجلس تحصیل کبیر والا ملتان	ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر	بمقام مطب [illegible] احمد دین صاحب (نمائندہ بزم)	
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون [illegible])	
فیصل آباد	ہر جمعہ ۴ بجے بعد دوپہر	بمقام حیات [illegible] کلینک ۲۳/پی پیپلز کالونی نمبر ۱ فون ۵۵۶۶ [illegible]	

اسلام کا سیاسی نظام

(عہدِ فاروقیؓ میں)

طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۸۷ء میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا۔ فاروقیت کیا ہے؟ یہ اتنا پسند کیا گیا کہ ہم سے مطالبہ کیا گیا کہ اس مقالہ میں تو اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ جو اسلامی نظام عہدِ فاروقیؓ میں رائج تھا اس کے کچھ تفصیلی گوشے سامنے لائے جائیں۔ ان میں سرِ فہرست "سیاسی نظام" تھا۔ ان تقاضوں کی تعمیل میں، پرویز صاحب کی مایہ ناز تصنیف "شاہکارِ رسالت" سے سیاسی نظام کا عنوان پیش خدمت کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں دو امور کی وضاحت تمہیداً ضروری معلوم ہوتی ہے۔

(۱) پرویز صاحب بھی صدرِ اوّل کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اس کا مدار بہرحال ہماری تاریخ پر ہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ اور ہماری تاریخ جس رطب و یابس کا مجموعہ ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ پرویز صاحب کا مسلک یہ ہے کہ اس تاریخ میں جو واقعات ایسے ہیں جو قرآن مجید کے خلاف نہیں، انہیں صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ اس لئے اس دور کی تاریخ کے متعلق جو کچھ پرویز صاحب لکھتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جو ان کی بصیرت کے مطابق قرآن کے مطابق ہے۔ بایں ہمہ، اگر ان کی کسی تحریر میں کوئی بات قرآن کے خلاف نظر آئے تو اسے ان کا سہوِ بصیرت سمجھنا چاہئے۔ اس کی اصلاح کے لئے وہ ہر وقت آمادہ ہوتے ہیں۔

(۲) قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ بیشتر اصول و اقدار عطا کرتا ہے۔ ان پر عمل درآمد کے طریق اُمّت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے طریق خود وضع کرے قرآنی اصول و اقدار و قوانین تو ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں لیکن انہیں نافذ العمل کرنے کے لئے طریق کار۔ یا یوں کہئے کہ جزئی قوانین، اسلامی مملکت وضع کرتی ہے، وہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلے جا سکتے ہیں۔ یہی صورت صدرِ اوّل کی اسلامی مملکت کی تھی۔ لہٰذا عہدِ فاروقیؓ کے سیاسی نظام میں جو جزئی قوانین دکھائی دیں، ضروری نہیں کہ وہ من و عن آج بھی نافذ کئے جائیں۔ آج کی اسلامی مملکت انہیں اپنے سامنے رکھے گی۔ ان میں سے جو قوانین ایسے ہوں گے جو آج بھی نافذ العمل ہو سکتے ہیں، انہیں اسی طرح نافذ کرے گی۔ دیگر قوانین میں تبدیلی کر دے گی۔ اور حسبِ الضرورت نئے قوانین کا اضافہ بھی کر سکے گی۔ بنابریں، جب آپ عہدِ فاروقیؓ کے سیاسی نظام کو سامنے لائیں تو اس سے یہ نہ سمجھیں کہ اسی قسم کا نظام ہو بہو نافذ کیا جائے تو اسے اسلامی نظام کہا جائے گا۔ صورت یوں نہیں ہوگی۔ اس

تاریخی مطالعہ سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ اس زمانے میں قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اس طرح نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس مطالعہ سے ہمیں یہ راہ نمائی حاصل ہوگی کہ کسی زمانے کی اسلامی مملکت کے طرق و اسالیب ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے

اس تمہیدی وضاحت کے بعد "شاہکار رسالت" سے سیاسی نظام کا عنوان ملاحظہ فرمائیے۔

سیاسی نظام۔ عہدِ فاروقی میں

قرآن کے سیاسی نظام (یا بالفاظِ دیگر ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ) کا اصل الاصول، عروۃ الوثقیٰ، یا اساس محکم، سورۂ آلِ عمران کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ خدا نے اسے ضابطۂ قوانین کا حامل یا منصب حکومت پر سرفراز یا مقام نبوت پر فائز بھی کیوں نہ کر دیا ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اس کتاب خداوندی کی رُو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے حقائق و غوامض پر غور و فکر کرنے سے اس کے معانی و مقاصد کی حقیقت تک پہنچتے ہو، ربانی بن جاؤ۔" (۳/۷۹)

یہ انسانی آزادی کا وہ عظیم انقلابی منشور ہے جس کی نظیر آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ انسانی فکر نے بھی غلامی اور محکومی کے استبداد سے تنگ آکر اس سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر سوچیں۔ پہلے اس نے شخصی حکومت (ملوکیت) کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر مذہبی پیشوائیت (تھیاکریسی) کی دسیسہ کاریوں کے دامِ ہمرنگ زمین کو توڑا۔ اس کے بعد اس نے جمہوری نظام اختیار کیا۔ انسانی فکر ابھی تک اسی مقام تک پہنچ سکی ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی مطمئن نہیں۔ اس لئے کہ انسانوں کی محکومی سے نجات جمہوری نظام میں بھی نہیں مل سکتی۔ اس میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک شخص (ملوکیت) کی محکومی کے بجائے انسانوں کے ایک گروہ (اکثریت) کی محکومی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ گروہ، دوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت "ذاتی حکم" کی رُو سے نہیں کراتا، اپنے وضع کردہ قوانین کی رُو سے کراتا ہے لیکن محکومی، کسی کے ذاتی فیصلہ کی ہو، یا اس کے فیصلہ کو قانون کا نام دے دینے کی، بات ایک ہی ہے۔ اس سے انسان، دوسرے انسانوں کی محکومی کی زنجیروں سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ طریق ہے جسے مندرجہ بالا قرآنی منشورِ آزادی کے آخری حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قانون سازی کا حق بھی کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسی کو خدا کا "حقِ حکومت" کہا گیا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے:-

انسانی آزادی کا منشور

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۔ (۱۲/۴۰)

یاد رکھو۔ حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

خدا کا یہ حقِ حکومت اس طرح خالصتاً اسی کے لئے مختص ہے کہ وہ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶)

وہ اپنے دائرہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا

لیکن خدا تو ہمارے سامنے (محسوس شکل میں) نہیں آتا۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت

کتاب اللہ کی حکومت

(محکومیت) کس طرح اختیار کی جائے۔ اس کا جواب اس نے خود ہی یہ کہہ کر دے دیا کہ اس کی اطاعت، اس کے عطا کردہ ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) کی رُو سے کی جائے۔ سورۃ الانعام میں ہے۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۔۔۔ (۶/۱۱۴)

(اے رسولؐ! ان سے کہو) کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم قرار دے لوں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

یہی کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز ہے۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝ (۵/۴۴)

جو اس کے مطابق فیصلے (حکومت) نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جائے گا۔

لیکن کتاب تو ساکت و صامت (حروف، نقوش) کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟

دین اور مذہب میں فرق

یہاں سے مذہب اور دین کا بنیادی فرق ہمارے سامنے آتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا (اور دُنیا کے تمام اہلِ مذاہب اسی خیال کے حامل ہیں) کہ یہ اطاعت، انفرادی طور پر کی جائے گی۔ یعنی ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتا رہے۔ اسے "مذہب" کہتے ہیں جس میں "خدا کی اطاعت" سے مراد اس کی پرستش ہوتی ہے۔ محکومیت نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن، انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی نظامِ حیات کی تاکید کرتا ہے۔ اسے دین کہا جاتا ہے[1] وہ کہتا ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا۔ (۳/۱۰۳) "تم اس ضابطۂ خداوندی کو اجتماعی طور پر تھامے رکھو"۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے نظامِ حکومت کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے واضح الفاظ

---

[1] مذہب اور دین کے اس فرق کے لئے میرے مجموعہ مضامین ـــــ بہارِ نو میں "قیامتِ موجود" کا عنوان دیکھئے۔ یا میری انگریزی زبان کی کتاب 'ISLAM : A CHALLENGE TO RELIGION'

میں کہہ دیا کہ تمہارے ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ (یعنی تمہاری اپنی حکومت) اسی سے تمہارے دین (اجتماعی نظامِ زندگی) کو تمکن حاصل ہوگا اور اسی سے تم اس قابل ہو سکو گے کہ خالصتہً خدا کی محکومیت اختیار کر سکو (۲۴/۵۵)۔ اس نظام (کی مرکزی اتھارٹی) کی اطاعت، خدا کی اطاعت کہلائے گی۔ ان امور کی تفصیل تیسرے اور ساتویں باب میں گزر چکی ہے۔ لیکن اس مقام پہ اس کا دُہرانا اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کے بغیر عہدِ فاروقی کا سیاسی نظام (جو اس کتاب کا عمودی موضوع ہے) اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ (اس تکرار کے لئے میں قارئین کے حسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہوں)

اسلام اپنی آزاد مملکت چاہتا ہے

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام ایک زندہ نظام (یعنی دین) کی حیثیت صرف اپنی ایک آزاد مملکت میں اختیار کر سکتا ہے۔ غیروں کی حکومت میں، یا خود مسلمانوں کی ایسی حکومت میں جس کی بنیاد کتابِ خداوندی پہ نہ ہو، اسلام ایک رسمی مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی حکومتوں کے تابع، مسلمان، اسلام کے مطابق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے، تحریکِ پاکستان کے دوران، ہندوستان کے علماء کی ایک جماعت کا موقف یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں بے شک حکومت اکثریت (یعنی ہندوؤں) کی ہوگی لیکن وہ جب ہمیں "مذہبی آزادی" کی ضمانت دیتے ہیں تو پھر مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کو آزادی، صرف اپنی آزاد مملکت میں میسر آسکتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت نہ ہو، قرآن کے احکام، قانونی شکل میں نافذ ہی نہیں کئے جا سکتے۔ اور (ظاہر ہے کہ) جو احکام، قانونی شکل میں نافذ نہ کئے جا سکیں، اُن کی حیثیت محض "وعظ" کی رہ جاتی ہے۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے قرآنی فریضہ سے مقصود ہی یہ ہے کہ احکامِ قرآنی کو قانوناً نافذ کیا جائے۔ اس کے بغیر معاشرہ کی اصلاح ہو نہیں سکتی۔ حضرت عثمانؓ کے ارشاد کے مطابق یَزَعُ اللّٰہُ بِالسُّلْطَانِ اَکْثَرَ مِمَّا یَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔ تنہا قرآن سے اتنی اصلاح نہیں ہو سکتی جتنی اصلاح (قرآنی) حکومت کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؎

مومناں را تیغ با قرآں بس است　　(اقبالؒ)

سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے اس حکومت کو قائم کیا، اور وہی اس کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ اس لئے خدا نے حضورؐ کی اطاعت کو خود خدا کی اطاعت قرار دیا جب فرمایا کہ وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (۴/۸۰) "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی"۔ قرآن کریم نے "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" (خدا اور رسول کی اطاعت کرو) کا جو حکم بار بار دیا ہے اس سے مراد اس نظامِ خداوندی کی اطاعت ہے جسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا[۱]۔ چونکہ اطاعت درحقیقت

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مقالہ "مرض تشخیص اور علاج" شائع شدہ طلوعِ اسلام بابت مئی-جون ۱۹۸۲ء۔

خدا کی، یعنی خدا کی کتاب کی، مقصود تھی۔ اس لئے رسول اللہ سے کہا گیا۔ کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸)

تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

(۲) لیکن قرآن کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں چند ایک احکام تو بالتصریح دیئے گئے ہیں لیکن باقی ہدایات

اصول و جزئیات کی پوزیشن

بطور اصول دی گئی ہیں۔ اس لئے ان کی جزئیات کو خود متعین نہیں کیا۔ ایسی کتاب کو جس نے تمام نوع انسان کے لئے قیامت تک مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات بننا تھا، ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا کہ اس کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں لیکن ان اصولوں کی روشنی میں، جزوی احکام، ہر زمانے کے تقاضوں اور اُمت کے احوال و ظروف کے مطابق مرتب ہوتے اور بدلتے رہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے واضح طور پہ کہہ دیا کہ جن احکام کو ہم نے صرف اصولی طور پہ دیا ہے اور ان کی جزئیات خود مرتب کر کے نہیں دیں، اس سے یہ نہ سمجھنا کہ خدا کو ایسا کرنا چاہیئے تھا لیکن یہ (معاذ اللہ) اس سے سہواً رہ گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ (۵/۱۰۱) اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق کتاب اللہ خاموش ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات نہ کیا کرو۔ ابھی وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہارے سوالات کے جواب میں، وحی کے ذریعے مزید احکام دے دیئے گئے تو ان کا نباہنا تمہارے لئے دشوار ہو جائے گا۔ سو تم بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر مزید پابندیاں عائد کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو؟ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ۔ (۵/۱۰۲) اس سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عائد کر کے زندگی کو ناقابلِ برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایات دینا بھول گئے ہیں۔ ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کی تشریح نبی اکرمؐ نے اپنی ایک حدیث میں یوں فرما دی کہ:- إِنَّ اللَّهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوهَا۔ وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا۔ وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا۔ اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے۔ انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور دیگر امور کے متعلق دانستہ خاموشی اختیار کی ہے ان کے متعلق کرید مت کرو۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ زبانِ وحی جن امور کے متعلق خاموش ہے۔ ان میں ان احکام کی جزئیات شامل ہیں جنہیں صرف اصولی طور پہ بیان کیا گیا ہے۔ باقی رہے وہ احکام جنہیں متعین طور پہ بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم نے نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا۔ اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہوں گے۔

(مثلاً) اس میں سرقہ (چوری) کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے لیکن سرقہ کی قانونی تعریف (DEFINITION) خود متعین نہیں کی۔ یا (مثلاً) اس نے خمر اور میسرہ کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی قسموں اور شکلوں کی تعریف خود بیان نہیں کیں۔

بنا بریں قرآن کریم نے ان احکام کی جزئیات کا تعین جنہیں اس نے اصولی طور پر بیان کیا ہے، اور جن احکام کو بالتصریح بیان کیا ہے، ان کی شرائط و احوال کی تبیین، نظامِ حکومتِ اسلامی پر چھوڑ دی ہے۔ جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا لیکن ان کی تفاصیل و جزئیات، جنہیں حکومتِ قرآنی متعین کرے گی، حالات کے تقاضے کے مطابق، بدلتی رہیں گی۔ اس طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے کتاب اللہ، تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطۂ زندگی بنتی چلی جائے گی۔

ان تفاصیل و جزئیات کا تعین سب سے پہلی اسلامی حکومت کے سربراہ، حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ قرآن کریم میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۹) "امورِ مملکت میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کرو"۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک وحیِ خداوندی کا تعلق ہے، اس میں کسی کے مشورہ کا تو ایک طرف، خود صاحبِ وحی کے ذاتی خیالات کا بھی کوئی دخل نہیں تھا۔ (۵۳/۳) لہٰذا مشورہ کا حکم، ان احکامِ خداوندی کی جزئیات و تفاصیل کے متعلق تھا جنہیں خدا نے اصولی طور پر دیا تھا یا جن کی شرائط و قیود خود بیان نہیں کی تھیں۔ ان جزئیات و شرائط کو حضورؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں اور قومِ مخاطب کے احوال و ظروف کے مطابق صحابہؓ کے مشورہ سے متعین فرمایا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات و شرائط کے متعلق یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ اگر انہیں بھی غیر متبدل رکھنا مطلوب ہوتا تو انہیں وحی کے ذریعے، قرآن کے اندر محفوظ کر دیا جاتا۔ یا جس طرح حضورؐ نے قرآن کریم مرتب اور محفوظ شکل میں اُمت کو دیا تھا، اسی طرح اپنے فیصلوں کا مستند اور مصدقہ مجموعہ، محفوظ طور پر اُمت کو دے جاتے۔ لیکن نہ خدا نے، قرآن کریم میں ان تفاصیل کو بیان کیا اور نہ ہی رسول اللہ نے انہیں محفوظ طور پر اُمت کو دیا (احادیث کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا طرزِ عمل باب چہارم میں بتایا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی۔) اس سے واضح ہے کہ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا، نہ مقصودِ رسالت۔ حضورؐ نے اس کے برعکس، ایک ایسا اصول بیان فرمایا جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُمت کے لئے، اپنے زمانے کے اسلامی نظام کے فیصلوں کا اتباع ہی مقصودِ خدا و رسول تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

رسول اللہ کی متعین کردہ جزئیات

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ۔

(مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے صاحبِ رشد و ہدایت جانشینوں کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔

حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی قرآنِ کریم میں بیان کردہ اس حقیقت کی تبیین ہے کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَائِنْ

مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ...... (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز ایں نیست کہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں۔ سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام آپؐ کی ذات تک محدود تھا) پھر اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔؟

بات بالکل واضح ہے کہ دین کا نظام، حضورؐ کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ اسے آپؐ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ اس نظام میں جس طرح حضورؐ کی زندگی میں، مرکزِ نظام کی اطاعت "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" تھی۔ یہی شکل حضورؐ کے جانشینوں کے زمانے میں بھی رہے گی۔ اسی نظام کو قرآن کریم نے "سبیل المومنین" کہہ کر پکارا ہے یعنی جماعتِ مومنین کا راستہ۔ (۴/۱۱۵)

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ایسا کیوں ہوا، لیکن (عام عقیدہ کے مطابق) خلافتِ راشدہ اوّلین چار خلفاءؓ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس لئے حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ "تم پر میری اور میرے خلفاء راشدینؓ کے طریقے کی پیروی لازم ہے"۔ اس کا اب عملی مفہوم، حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ (چار خلفاء) کی سنت (طریق) لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہ تو حکم خداوندی تھا، نہ ارشادِ نبویؐ کہ خلافتِ راشدہ، چار خلفاء تک محدود رہے گی۔ دین کے نظام کا تو ہمیشہ کے لئے جاری رہنا مطلوب تھا۔ یہ اتفاق تھا (اور امت بلکہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی) کہ وہ نظام زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ لیکن اگر وہ قائم رہتا (اور جب تک قائم رہتا) تو اس کی اطاعت "خلافتِ راشدہ" کی اطاعت قرار پاتی۔ یعنی اُمت کے لئے اطاعت اپنے زمانے کے نظامِ اسلامی کی لازم ہوتی، نہ کہ کسی سابقہ زمانے کے نظام کی۔ اور اس کی وجہ حضورؐ نے خود ہی یہ کہہ کر بیان فرما دی کہ:

النّاس اشبه بزمانهم من اسلافهم۔ (جاحظ البیان والتبیین)

لوگ اپنے اسلاف کے مقابلہ میں اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ

اگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے پاتے اور میں آپؐ کو پاتا (یعنی ہم دونوں ہمعصر ہوتے) تو آپؐ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (تاریخ بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۳۹۰)

زمانے کے تقاضوں کے مطابق فیصلے

مطلب یہ ہے کہ نبی اکرمؐ پیش آمدہ معاملات کے فیصلے، قرآن کے اصولی احکام کی روشنی میں صحابہؓ کے مشورہ سے کیا کرتے تھے۔ اگر میں (یعنی امام اعظمؒ) اس زمانے میں ہوتا تو آپؐ اکثر معاملات میں میری رائے قبول فرما لیتے اور اس طرح میری رائے شریعت کا حکم قرار پا جاتی۔ امام اعظمؒ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے کہ:

ابوعوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی

آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر اس (درہم) ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلاری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس کی سند کو پہنچیے۔ ورنہ اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ آپ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے

(بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۳۹)

مطلب واضح ہے کہ حضورؐ کا وہ فیصلہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ اس لئے اس فیصلہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہیئے۔ اسی اصول کے مطابق "تعلیل الاحکام" میں آیۂ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۱/۱۰۷) کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ

زمانے کے بدلنے سے نئے نئے مصالح پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر صرف منصوص ہی کا اعتبار کیا جائے تو لوگ سخت مصیبت میں پھنس جائیں۔ یہ بات رحمت کے منافی ہوگی۔

(تعلیل الاحکام۔ صفحہ ۲۸۸)

یعنی حضورؐ کے رحمت للعالمین (تمام زمانوں کے لئے رحمت) ہونے کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق احکام نافذ کئے جائیں۔ امام ابن قیمؒ نے اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ:

شریعت اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (الطرق الحکمیہ)

یعنی دین کے اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں پر عمل اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اس اصول کے متعلق اپنے خطبات (تشکیل جدید) میں بڑی بصیرت افروز بحث کی ہے۔ وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم تیار کرتا ہے اور اسے ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے، اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اُس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے اس رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں کہ:

غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظمؒ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے

کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیثوں پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) لکھا ہے کہ

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل و تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دُنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن ابدی اصولوں کے متعلق اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ــــ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے۔ کیسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عملی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ (ایضاً)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

یہ سوال کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت سی دینی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً ہاں میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دُنیا عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

دورِ فاروقی میں اس اصول پر عمل

اب ہم اس دَور کی کچھ مثالیں سامنے لاتے ہیں۔ (یعنی دَورِ فاروقی کی) جس میں، یہ "روحِ عمرؓ" عملی پیکروں میں کارفرما تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو حضورؐ کے زمانہ کو گزرے ہوئے تھوڑا سا عرصہ ہوا تھا ــــ یعنی یہی دو تین برس۔ لیکن چونکہ اب مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اس لئے حالات میں کافی تبدیلی آ رہی تھی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر آپ نے (حضرت عمرؓ نے) فرمایا تھا کہ

بے شک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)۔

چنانچہ ان کا طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی نیا معاملہ سامنے آتا آپ سابقہ ادوار کی حکومتوں (یعنی رسالت مآبؐ

اور عہد صدیقی) کو دیکھتے۔ اگر وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ملتا جو اس معاملہ کے تقاضوں کو پورا کر دیتا تو اسے من وعن نافذ کر دیتے۔ اگر اس میں کسی ترمیم وتنسیخ یا حک و اضافہ کی ضرورت ہوتی تو ترمیم شدہ فیصلہ صادر فرما دیتے اور عند الضرورت اپنا جدید فیصلہ نافذ کر دیتے۔ اور بعض اوقات (حالات کی تبدیلی کے پیش نظر) خود اپنے سابقہ فیصلہ میں بھی تبدیلی کر دیتے یعنی وحی کے متعین کردہ احکام واصول اپنی جگہ غیر متبدل رہتے لیکن ان کے عملی نفاذ کی شکلوں اور جزئیات میں حالات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتیں ثبات وتغیر کا یہی حسین امتزاج ہے جس سے اسلام ایک عالمگیر اور ابدی نظام حیات بن سکتا ہے، اور عہد فاروقی اس کی درخشندہ مثال پیش کرتا ہے۔

(۱) نظام مشاورت

کسی سابقہ حکم کا من وعن نافذ کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا، لیکن ان احکام کا اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ کرنا یا غیر متبدل اصولوں کی جزئیات کا پیش نظر تقاضوں کے مطابق متعین کرنا، بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے، بالخصوص جب ان احکام وجزئیات نے دین کی حیثیت اختیار کرنی ہو۔ اسی مشکل کے پیش نظر، قرآن کریم نے رسول اللہ کو بھی حکم دیا کہ ان امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو (۳/۱۵۹) اور حضورؐ کے بعد اُمت سے بھی کہا کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے (۴۲/۳۸) یہ وجہ ہے جو دین کے نظام میں مشاورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

یورپ نے، ملوکیت اور تھیاکریسی سے تنگ آکر، جمہوریت (ڈیماکریسی) کا نظام وضع کیا اور اس کے حق میں ایسی ڈگڈگی بجائی کہ ساری دُنیا اُسے آیۂ رحمت سمجھنے لگ گئی۔ ان کی دیکھا دیکھی مسلم اقوام نے بھی اُسے اپنے ہاں رائج کر لیا اور طُرفہ تماشہ یہ کہ اسے عین مطابق اسلام قرار دے دیا چنانچہ

مغربی جمہوریت اور اسلام

آج اس نظریہ کو مسلّمہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ "جمہوریت عین اسلام" ہے بلکہ یہ کہ جمہوریت کی طرح ہی اسلام نے ڈالی تھی۔ یہ تصور غلط اور یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ مغربی جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدار مطلق (Sovereignty) عوام کو حاصل ہے۔ عوام کے نمائندے جس قسم کا جی چاہے قانون مرتب کر سکتے ہیں۔ انہی کا فیصلہ حرف آخر ہے۔ ان سے بالا کوئی اتھارٹی نہیں۔ یہ سیکولرازم ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ کسی ایک ملک کے عوام یا ان کے نمائندگان تو ایک طرف، پوری نوع انسان کو بھی حاصل نہیں۔ اقتدار مطلق صرف خدا کو حاصل ہے اور اسلامی نظام (یعنی اُمت کے نمائندگان) کتاب اللہ کے حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔ مغربی انداز جمہوریت اور اسلام کے نظام مشاورت میں یہ بنیادی فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اسلامی نظام کو آپ "کنٹرولڈ ڈیماکریسی" کہہ سکتے ہیں یعنی وہ جمہوریت جس

پر قرآن کا کنٹرول ہو۔

قرآنِ کریم نے امت کے لئے مشاورت کو ضروری تو قرار دیا لیکن، اپنے مخصوص انداز کے مطابق مشاورت کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مشاورت کا طریقِ کار خود متعین کرے۔

مشاورت کی مشینری

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں زندگی بڑی سادہ سی تھی اس لئے مشاورت کی مشینری بھی کچھ ایسی وسیع و عریض نہیں تھی۔ اس کے لئے طریقِ کار کیا تھا، اسے ساتویں باب کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے آپ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیں۔ مختصراً" امیر المومنین کی مجلسِ مشاورت" اعیانِ مدینہ تک محدود تھی اور اہم معاملات میں صوبوں کے نمائندوں کو بھی بلا لیا جاتا تھا مجلسِ مشاورت میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے اولو العزم صحابہؓ شامل تھے۔ یہ سب معمر اور پختہ کار تھے۔

نوجوانوں اور عورتوں سے مشورہ

لیکن حضرت عمرؓ نوجوانوں کی بھی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے۔ اور اکثر معاملات میں ان سے بھی مشورہ لیا کرتے حتیٰ کہ عورتوں سے بھی۔ عام انتظامی امور اور بندوبست کے سلسلہ میں آپ ذمی رعایا کو بھی شریکِ مشاورت کر لیتے تھے۔ کیونکہ ان معاملات کا تعلق بیشتر ان سے ہوتا تھا۔ آپ دیگر مملکتوں کے آئین و قوانین کا بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں غیر مسلم[1] بلا روک ٹوک مکہ معظمہ آتے جاتے تھے (کتاب الخراج - امام ابو یوسف - بحوالہ شبلی نعمانی) دیگر ممالک کے احوال و کوائف اور قوانین و ضوابط کے متعلق ان کے ذریعے بھی معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔

مغربی اندازِ جمہوریت میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ سربراہِ مملکت پارلیمان کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے یا اسے ویٹو کے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔

اکثریت کے فیصلے

ہمارے ہاں آئین سازی کے سلسلہ میں، اس موضوع پر بڑی بحث و تمحیص ہوتی رہی اور (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) اسے اسلامی معیار کے مطابق پرکھنے کے مدعی، اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید اور مخالفین کی تردید میں صدرِ اول سے اسناد پیش کرنے لگے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس اصول کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام میں یہ انداز ہی صحیح نہیں کہ جو معاملہ پیش آئے اس کے فیصلہ کے لئے صدرِ اول کے طریق کو بطور سند پیش کر دیا جائے۔ اول تو اس دور کی تاریخ میں مخالف، موافق ہر قسم کے شواہد اور اقوال مل جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں صدیوں سے چلے آنے والے اختلافات کا بنیادی

---

[1] ابن الجوزی بحوالہ حفظا دنی۔ (مطبوعہ بیروت صفحہ ۱۷۱) یاد رکھئے۔ غیر مسلموں سے مشورہ لیا جا سکتا ہے۔ انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ جس حکومت کا مقصد کتاب اللہ کے احکام کا عملی نفاذ ہو، اس میں وہ لوگ کیسے شریک ہو سکتے ہیں جو اس کتاب پر ایمان ہی نہ رکھیں۔

سبب یہی ہے)۔ دوسرے، قرآنی نظام کی رُو سے، کسی سابقہ دَور کا کوئی فیصلہ، آنے والے دَور کے لئے قولِ فیصل نہیں قرار پا سکتا۔ اُن کا فیصلہ اُن کے زمانے کے احوال و ظروف کے مطابق تھا۔ ہمارا فیصلہ ہمارے زمانے کے تقاضوں کے مطابق۔ سابقہ ادوار کے فیصلوں سے بطور نظائر تو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ انہیں سند اور حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بنا بریں، اس قسم کی بحثیں، بجز اس کے کہ ان سے اختلافات بڑھیں، کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں کر سکتیں۔

اس سوال کے متعلق کہ سربراہ مملکت، اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہے یا اسے ویٹو کا اختیار بھی حاصل ہے، صدرِ اوّل کی تاریخ میں دونوں قسم کے شواہد مل جاتے ہیں۔ ملے ایسے واقعات بھی جن میں امیر المومنینؓ نے اکثریت کے فیصلوں کو تسلیم کر لیا ہو۔ حتّٰی کہ طبقات ابن سعد میں عمالِ حکومت کے نام حضرت عمرؓ کی یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ "جس معاملہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو، اس میں صحابہؓ کی اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے"۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ایسے فیصلے بھی جو اکثریت کی رائے کے خلاف تھے۔ (مثلاً) رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، مانعین زکوٰۃ کا جو پہلا معاملہ زیرِ غور آیا تو حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے اور صحابہؓ کی بڑی اکثریت اس کے خلاف تھی۔ (ان میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے) لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اکثریت کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے عمل اپنے فیصلے کے مطابق کیا۔ اور اس فیصلے کی اطاعت، مخالف و موافق سب نے بدل و جان کی۔ (یہی اُس دَور کی خوبی تھی) اس ضمن میں دو اہم امور پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر معاملہ کے متعلق اصولی ہدایت قرآن کریم میں موجود ہوتی تھی اور فیصلہ طلب معاملہ صرف یہ ہوتا تھا کہ اس اصول پر عمل کس طرح کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ امیر المومنین اگر اکثریت کی رائے کو مسترد کرتا تھا تو وہ ایسا دھاندلی سے نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے فیصلے کے حق میں دلائل و براہین پیش کرتا اور اختلاف رکھنے والوں کو مطمئن کرتا۔ وہ جو کچھ کرتا کھلے بندوں کرتا اور اس کے لئے قرآنی سند پیش کرتا (مثلاً) جب عراق کی زمینوں کا سوال سامنے آیا ہے (جس کی تفصیل معاشی نظام میں پیش کی جائے گی) تو صحابہؓ کی اکثریت نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس پر کئی دنوں تک بحث ہوتی رہی اور بحث میں ہر شخص پوری جرأت اور بے باکی سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا رہا۔ (اسی کو روحِ جمہوریت کہتے ہیں)۔ اس پر بھی معاملہ جب کسی فیصلہ کن مرحلہ تک نہ پہنچ سکا تو حضرت عمرؓ نے مزید غور و فکر کے لئے مہلت چاہی۔ اس مہلت کے وقفہ کے بعد، جب انہوں نے اس مسئلہ کو مجلسِ مشاورت کے سامنے دوبارہ پیش کیا تو اس سلسلہ میں جو افتتاحی تقریر فرمائی، وہ غور طلب ہے۔ آپ نے فرمایا:-

سندِ کتاب اللہ کی ہوتی تھی

میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور بعض نے موافقت۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ

> میری بات محض اس لئے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب خداوندی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں کبھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کے لئے ایسا کرتا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس دوران میں غور و فکر کے بعد مجھے قرآن کریم سے ایسی راہ نمائی مل گئی ہے جس کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بآسانی ہو سکتا ہے اور وہ یہ آیات ہیں۔ اس پر مخالفین نے کہا کہ اب ہمارا سینہ بھی کشادہ ہو گیا ہے اور ہم آپ سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ تھا اختلافی امور میں انداز اپنی رائے کے پیش کرنے کا۔ اور اسی بنا پر حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ

> جب عمرؓ کوئی راہ اختیار کر لیتے تو وہ بات ہمارے لئے آسان ہو جاتی تھی۔

وحی اور اپنی رائے میں فرق

اس کے باوجود، آپ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ "یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اُسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہی ہے، یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے ہے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے۔ اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے امت کے لئے سنت نہ بناؤ"۔ اس باب میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس میں، جب جسم سے اس قدر خون بہ رہا تھا اور آپ درد کی شدت سے نڈھال تھے، آپ نے اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے کہا کہ "وہ ہڈی لاؤ۔ جس پر میں نے دادا کے حصہ کے متعلق کچھ لکھا تھا"۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ اس تحریر کو مٹا دیا جائے۔ بیٹے نے کہا کہ آپ اس وقت سخت تکلیف میں ہیں۔ یہ کام آپ کی طرف سے ہم بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے سختی سے کہا کہ تم اس کی اہمیت اور میری ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ۔ وہ ہڈی لاؤ۔ چنانچہ آپ اطمینان سے نہ بیٹھے جب تک وہ ہڈی نہ آ گئی۔ اور آپ نے اپنی تحریر کو اپنے ہاتھوں سے نہ مٹا ڈالا۔ —— احتیاط یہ تھی کہ عمرؓ کی رائے بعد میں آنے والوں کے لئے سند نہ بن جائے۔

آئیے! اب ہم دیکھیں کہ خدا کی وحی اور اپنی رائے میں فرق کرنے والوں کے دور میں قانون سازی کا طریق کار کیا تھا —— یہ گوشہ گہری توجہ اور غور و فکر کا متقاضی ہے کہ اس میں ثبات و تغیر کا وہ امتزاج جو دین کی ابدیت کا ضامن ہے، بڑے حسین انداز میں نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

---

(۲) قانون سازی کا طریق

اسلامی مملکت کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ قرآنی احکام و ضوابط کی تنفیذ، اور اس کے اصول و اقدار کی ترویج کا ذریعہ ہے۔ اس کے لئے اس کا طریق کار یہ ہے کہ ہر دور کی حکومت:

(۱) اپنے سے پہلے دَور کی حکومت کے فیصلوں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتی ہے۔

(۲) لیکن اگر زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان میں مناسب ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کر دیتی ہے۔ اور

(۳) اگر کسی معاملہ کے متعلق پہلے سے کوئی فیصلہ موجود نہ ہو، تو وہ نیا فیصلہ صادر کر دیتی ہے لیکن

(۴) سابقہ فیصلوں میں تغیر و تبدل ہو یا کسی نئے فیصلہ کا صدور، اس کا کوئی اقدام قرآنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آزادی کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کی طرح ؎

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

یہ "شاخِ آشیانہ" خدا کی کتاب عظیم ہے جسے اس نے حبل اللہ (اللہ کی محکم رسی) اور عروۃ الوثقیٰ (ناقابلِ شکست سہارا) کہہ کر پکارا ہے۔

قرآن کے مطابق احکام

اس "سہارے" کو حضرت عمرؓ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے جابیہ کے خطبہ میں فرمایا:-

مجھے اللہ نے جو حکومت عطا کی ہے اس کی اصلاح صرف تین چیزوں سے ہو سکتی ہے۔ امانت کی ادائیگی۔ (مجرمین اور مخالفین کی) قوت کے ساتھ گرفت۔ اور کتاب خداوندی کے مطابق حکم دینا۔

اپنے ایک اور خطاب میں فرمایا:-

حاکم کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں۔ جو اللہ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کا مہر مقرر کرنے میں بڑی افراط سے کام لے رہے ہیں تو آپ نے ایک اجتماع میں اس کا ذکر کیا اور چاہا کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے۔ اس پر ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ یہ کیا؟ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ وَ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا۔ (۴/۲۰) "اور تم نے بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو"۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر بول اٹھے کہ عورت نے سچ کہا ہے، عمرؓ غلطی پر تھا۔

(ضمناً) ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو حضرت عمرؓ نے یہ بات اصولِ مساوات کی اہمیت اور قرآن کے مطابق بات کرنے کے سلسلہ میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کہی ہوگی، ورنہ قرآن کے اس حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ مہر پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ اوّل تو اس آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ تم جس قدر مہر مقرر یا ادا کر چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔ دوسرے یہ کہ قرآن نے جس بات کو مطلق (بلا قیود و شرائط) چھوڑا ہے۔ اسلامی نظام، مصالحِ امت کے پیشِ نظر اسے مقید کر سکتا ہے یعنی اس پر شرائط عاید کر سکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خلافتِ فاروقی

میں بھی اصلاً و اساساً اطاعت احکام خداوندی ہی کی تھی۔ باقی رہیں ان احکام کی جزئیات اور ان کے تعین کا طریق کار۔ سو اس باب میں حضرت عمرؓ نے اصولاً ان فیصلوں کو برقرار رکھا جو ان سے پہلی حکومتوں۔ (عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صدیقیؓ) نے صادر کئے تھے، لیکن تغیّرِ حالات کے ماتحت جن فیصلوں میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، ان میں تبدیلی بھی کر دی۔ کتب روایات میں ان اختلافی فیصلوں کی تفاصیل موجود ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک بطورِ مثال پیش کرتے ہیں:-

اختلافی فیصلے

(۱) سب سے پہلی مثال تو وہ ہے جو آج تک اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ حضرات میں مابہ النزاع چلی آرہی ہے۔ روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص بیک وقت تین دفعہ طلاق کہدے تو رسول اللہ اور حضرت صدیقؓ کے زمانے تک اُسے ایک طلاق ہی شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں دو سال تک یہی قانون رہا۔ لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس باب میں غیر محتاط ہوتے جا رہے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایسی طلاقیں تین شمار ہوں گی (یعنی یہ ایسی طلاق متصور ہوگی جس کے بعد یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کر سکیں گے۔)

(ضمناً۔ ہماری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کی رُو سے "تین طلاقوں" کا مفہوم اور قاعدہ کچھ اور ہے۔ اس کی وضاحت میری کتاب "قرآنی قوانین و اقدار" میں ملے گی۔ اس روایت کو جس مقصد کے لئے درج کیا گیا ہے، وہ ذرا آگے جا کر سامنے آئے گا۔)

(۲) رسول اللہ کے زمانے میں قانون یہ تھا کہ اگر کوئی غیر مسلم، اسلام قبول کر لیتا تو جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے پاس رہتی لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں یہ تبدیلی کر دی کہ اس کی جائیداد غیر منقولہ اس بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس کی کفالت کے لئے حکومت کی طرف سے (باقی مسلمانوں کی طرح) وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔

(۳) رسول اللہ کے زمانے میں شراب خوار کو جوتے وغیرہ مار کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرابی کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی۔ اور حضرت عمرؓ نے اُسے بڑھا کر اسّی کوڑے کر دیا۔

(۴) قرآن کریم نے صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا تھا یعنی جن لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر کسی قسم کا ناقابلِ برداشت نقصان پہنچے، ان کے نقصان کی تلافی کے لئے حکومت ان کی مالی امداد کرے۔ یہ حکم عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صدیقیؓ میں جاری رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب مسلمانوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں، اس لئے اس امداد کی ضرورت نہیں رہی۔

(۵) ارکانِ حج میں رمل بھی ایک رکن ہے یعنی طواف کے وقت پہلے تین چکر ذرا تیز چل کر لگائے جاتے ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ رسول اللہ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو مخالفین نے مشہور کر دیا کہ وہاں جا کر مسلمان بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ طواف میں ذرا اکڑ کر تیز چلا کریں تاکہ مخالفین دیکھ لیں کہ ہم یہاں آکر کمزور نہیں ہو گئے۔ اس سے یہ روش حج کا ایک رکن (ضروری معمول) بن گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں کہا کہ اب ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے، نہ وہ حالات

رہے، نہ وہ مصلحت، نہ وہ مخالفین رہے نہ ان کا طنز۔ اب یہاں معمول کے مطابق طواف کرنا چاہئے۔

(۶) قرآن کریم نے مسلمانوں کے لئے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ہاں کا کھانا حلال قرار دیا ہے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی عورتوں سے یہ کہہ کر نکاح کو ممنوع قرار دے دیا کہ یہ عورتیں مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں کی بستیوں سے یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے یہ کہہ کر بند کرا دیئے کہ اب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہی۔

(۷) حضرت عمرؓ نے اُم ولد (یعنی وہ لونڈی جس کے مالک سے اسے اولاد ہو گئی ہو) کی بیع ممنوع قرار دیدی حالانکہ رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس کی ممانعت نہیں تھی۔ (واضح رہے کہ یہ حکم ان لونڈیوں کے متعلق تھا جو اسلام سے پہلے عربوں کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ غلام اور لونڈیوں کے متعلق تفصیلی بحث پچھلے باب میں آچکی ہے)۔

(۸) اس سلسلہ کی سب سے اہم مثالیں دو (اور) ہیں۔ ایک عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ۔ اس اہم واقعہ کی تفصیل تو ہم "معاشی نظام" سے متعلق باب میں بیان کریں گے، اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ (جیسا کہ اس سے پہلے بھی متعدد لکھا جا چکا ہے) رسول اللہ اور خلافتِ صدیقیؓ میں قانون یہ تھا کہ مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فتح عراق کے وقت، مالِ غنیمت میں کثیر مزروعہ زمینیں بھی ملیں۔ سابقہ قاعدہ کے مطابق، مطالبہ ہوا کہ انہیں بھی سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ان زمینوں کی پیداوار پر ساری امت اور آنے والی نسلوں کی پرورش کا دارومدار ہے اس لئے انہیں انفرادی ملکیت میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ حضرت عمرؓ کا برقرار رہا۔ یہ سابقہ معمول سے بڑا اہم اختلاف تھا۔

دوسری مثال، افرادِ امت کے وظائف کے تعین کا معیار تھا۔ رسول اللہ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں اس کا معیار، ہر فرد یا خاندان کی معاشی ضرورت تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس قانون کو بدل دیا اور اسلام کی خدمت کے لحاظ سے مدارج مقرر کر کے انہیں وظائف کا معیار قرار دے دیا۔ یہ اختلاف بھی بہت اہم تھا جس کی تفصیل "معاشی نظام" میں پیش کی جائے گی۔ وہیں یہ بھی بتایا جائے گا کہ ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ حضرت عمرؓ کا اجتہادی سہو تھا جس کا بعد میں انہیں خود بھی احساس ہو گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کا ازالہ کرتے، ان کی شہادت ہو گئی۔

اوّلیات حضرت عمرؓ

یہ ان امور کی چند ایک مثالیں ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے عہدِ رسالتؐ مآب اور دورِ صدیقیؓ کے فیصلوں سے اختلاف کیا۔ ان کے علاوہ، جو نئے امور سامنے آئے ان کے متعلق آپ نے (پہلی بار) اپنے فیصلے صادر فرمائے۔ انہیں حضرت عمرؓ کی "اوّلیات" کہا جاتا ہے اور ان کی فہرست طول طویل ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مملکت کی وسعت اس قدر بڑھ گئی تھی اور نئے نئے امور نہایت تیزی سے سامنے آ رہے تھے، تو مملکت کے لئے ضروری تھا کہ ان کے تصفیہ کے لئے ضروری احکام نافذ اور قواعد و ضوابط منضبط کرے۔ ان میں سے چند ایک (تمثیلاً) درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

(۱) خزانہ قائم کیا۔ (۲) سن ہجری رائج کیا۔ (۳) دفاتر قائم کیے۔ اور رجسٹر مرتب کرائے۔ (۴) مردم شماری کرائی۔ (۵) شہر آباد کرائے۔ نہریں کھدوائیں۔ (۶) عشورہ (یعنی محصول چنگی) کی ابتدا کی۔ (۷) دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر زکوٰۃ (حکومت کا ٹیکس) عائد کیا۔ (۸) نماز تراویح جماعت سے قائم کی۔ (۹) نماز فجر کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کیا۔ (۱۰) مساجد میں روشنی کا انتظام کرایا۔ وغیرہ ذٰلک

حاصلِ بحث

ان تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلامی نظام میں :-

(۱) قانون کا سرچشمہ قرآن کریم ہے۔ اس کے احکام، اصول اور اقدار سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

(۲) جن امور کو قرآن نے جائز قرار دیا ہے، اگر اسلامی نظام چاہے تو (بتقاضائے حالات) انہیں وقتی طور پر ممنوع قرار دے سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام انہیں ابدًا حرام قرار نہیں دے سکتا۔ مصالح امت کے مطابق ان پر وقتی پابندی عائد کر سکتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی حرام کو حلال قرار دے سکتا ہے۔

(۳) جن احکام کو قرآن نے مطلق (بلا شرائط و قیود) بیان کیا ہے، اسلامی نظام ان پر عند الضرورت قیود اور شرائط عائد کر سکتا ہے۔ اور بعض احکام کو وقتی طور پر ساقط العمل بھی قرار دے سکتا ہے۔

(۴) سابقہ ادوار کے فیصلوں میں، خواہ وہ رسول اللہ کے زمانے میں ہی کیوں نہ صادر ہوئے ہوں، ردّ و بدل کر سکتا ہے۔ اور بعض فیصلوں کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔

(۵) نئے پیش آمدہ معاملات کے متعلق نئے احکام بھی صادر کر سکتا ہے۔

یہ ہے اسلامی حکومت میں قانون سازی کا اصول۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ احکام و قوانین میں کسی قسم کا ردّ و بدل، یا حک و اضافہ، صرف اسلامی نظام حکومت کر سکتا ہے۔ کسی فرد یا کسی جماعت کو اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں حضورؐ کا یہ ارشاد گرامی واضح ہے کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا حق امیر کو حاصل ہے یا اسے جسے امیر اس مقصد کے لئے مقرر کرے۔

حضرت عمرؓ نے اس کی تشریح میں فرمایا تھا کہ :-

یہ کام اس کے لئے رہنے دینا چاہئے جو اس کے نفع و ضرر کا ذمہ دار قرار پا سکتا ہے۔

یہ تھا اسلامی نظام میں قانون سازی کا اصول لیکن جب (بعد میں) مسلمانوں کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو پھر یہ تمام اصول بدل گئے۔ اُس وقت، نہ اسلامی نظام حکومت باقی رہا، نہ اس کا مرکز۔ دین اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ امور سیاست حکومت نے . . . . اپنی تحویل میں لے لئے، . . . . اور مذہبی امور علماء کے سپرد کر دیئے۔ "مذہبی امور" سے مراد تھی عقائد کی بحث اور پرسنل لاء (شخصی قوانین)۔ بالفاظ دیگر، اُس وقت، اسلام (دین کے بجائے) مذہب بن کر رہ گیا اور مسلمانوں کی حکومت سیکولر ہو گئی۔ مملکت کے معاملات میں فرماں رواؤں نے اپنی من مانی

پاکستان میں

کی، اور مذہبی امور میں علماء اور فقہاء نے اپنا حکم چلایا۔ امت کے مرکز (اسلامی نظام) کے خاتمے کا لازمی نتیجہ تھا کہ امت میں فرقے پیدا ہو جاتے — فرقے، جن کے وجود کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۱) چنانچہ فرقے پیدا ہوئے اور ہر فرقے نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق فتوے دینے شروع کر دیئے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔

تشکیلِ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یہاں پھر سے صدرِ اوّل کے اسلامی نظام کا احیاء کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال قانون سازی کا تھا۔ جب یہ بحث چھڑی تو اسلامی نظام کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا۔ اس لئے ہر فرقہ نے اپنی اپنی بات کہنی شروع کر دی۔

(۱) ایک فرقہ نے کہا کہ جو کچھ کتب احادیث میں درج ہے، اسلامی حکومت کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس میں سے کسی حکم کو معطل یا منسوخ کر دینا تو درکنار، اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل بھی کر سکے۔ ایسا کرنا انکارِ سنت ہوگا۔ نیز اسلامی حکومت کو اس کا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ کوئی نیا حکم نافذ کر سکے۔ یہ بدعت ہوگی جس کی دین میں قطعاً اجازت نہیں۔

(۲) دوسرے فرقہ نے کہا کہ جو کچھ ہمارے ائمہ فقہ نے فیصلہ کر دیا ہے، اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ من و عن ان فیصلوں کو نافذ کرے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا اُسے حق حاصل نہیں۔

جدید امور کے متعلق ان میں سے بعض لوگ اتنی اجازت دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت، فقہاء کے فیصلوں کی روشنی میں نئے احکام نافذ کر سکتی ہے۔ لیکن دوسرے حضرات اس کی بھی اجازت نہیں دیتے وہ کہتے ہیں کہ اب اجتہاد کا دروازہ یکسر بند ہے۔

(۳) جہاں تک قرآنی احکام کا تعلق ہے، اہلِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ کی حدیث، قرآنی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے[1]۔ اور اہلِ فقہ کا عقیدہ کہ اگر قرآن کی کوئی آیت، ان کے ائمہ کے کسی فیصلہ کے خلاف ہو تو اوّل تو اس آیت کی ایسی تاویل کرنی چاہئے جو ائمہ کے فیصلہ کے مطابق ہو۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھنا چاہیئے۔ (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ خضری صـ۲۲۱)۔

(ان امور پر تفصیلی بحث آخری باب میں ہوگی)۔

اس وقت ہمارے علماء کرام کا یہی مسلک ہے اور تعجب ہے کہ اہلِ حدیث حضرات ہوں یا اہلِ فقہ، حضرت عمرؓ کو مومن حقا اور خلیفۂ راشد تسلیم کرتے ہیں، اور انکے عہدِ خلافت کو اسلامی حکومت کا بہترین آئینہ دار قرار دیتے ہیں۔

ان حضرات کا جو مسلک اوپر بیان کیا گیا ہے اور جس کے متعلق انہیں اصرار ہے کہ وہ عین اسلام ہے ظاہر ہے کہ اس کی رُو سے قانون سازی کے سلسلہ میں کوئی حکومت بھی دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا

---

[1] مثلاً قرآن کی آیت متعلقہ وصیت کو ایک حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "فتنہ انکارِ حدیث" از علامہ محمد ایوب مرحوم صـ۸۵)۔

نہیں کر سکتی۔ لیکن چونکہ (اس پچیس سال میں) کسی حکومت میں اس کی جرأت نہیں تھی کہ وہ عہدِ فاروقی کی نظیر پیش کرکے، قانون سازی کے لئے صحیح اسلامی طریق اختیار کرے اور اس طرح علماء حضرات سے جھگڑا مول لے، اس لئے انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ آئین میں تو یہ الفاظ درج کر دیئے جائیں کہ "پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ لیکن عملاً وہی کچھ ہونے دیا جائے جو ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہم آج بھی اُسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں انگریز کے عہدِ حکومت میں تھے۔ (اس سلسلہ میں راقم الحروف اپنے اقدامات کا تذکرہ کرنے کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہے)۔

میں نے جرأت کی اور کہا کہ قانون سازی کے لئے ہمارے سامنے عہدِ فاروقی بہترین نمونہ ہے۔ ہمیں ان اصولوں کے مطابق ضابطہ قوانین مرتب کر لینا چاہیئے۔ علماء حضرات نے اسے "انکارِ سنت" قرار دے کر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اور اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ـــــ اسلامی ضابطہ قوانین نہ بننا تھا، نہ بنا، نہ بن سکے گا۔ اس کا اعتراف خود ان حضرات نے بھی کر لیا ہے کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو[1]۔ یہ اعتراف بھی ہے، اور اس پر اصرار بھی کہ ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ یا للعجب!

یاد رکھئے! وہی اسلامی حکومت، اسلامی ضابطہ قوانین مرتب کر سکے گی جو خلافتِ فاروقی کو اپنے لئے اسوۂ (نمونہ) قرار دے کر وہ عہد، عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صدیقیؓ دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

لیکن ایسا وہی کر سکے گا جو صرف خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرے، علماء حضرات کے کفر کے فتووں سے نہ ڈرے۔ اس مقام پر ہم ایک بار پھر اقبالؒ کے الفاظ دہرا دینا چاہتے ہیں کہ

"ایسا وہی حکومت کر سکے گی جو روحِ عمرؓ کو لے کر آگے بڑھے"۔

معلوم نہیں اس کی سعادت کس ملک کے حصے میں آئے گی!

آوازۂ حق اُٹھتا ہے کب، اور کدھر سے ـــ مسکیں دلکم ماندہ دریں کش مکش اندر

(۳) قانون سازی ہی نہیں ـــ سیرت سازی بھی

حضرت عمرؓ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ قانون خواہ کیسا ہی مکمل، جامع، اور استقام سے منزہ کیوں نہ

[1] یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

[2] "اگر مسلمانوں کی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم ہونے کے لئے یہ شرط قرار دے دی جائے کہ ملک میں جتنے مختلف مسلکوں کے مسلمان موجود ہیں وہ سب کسی ایک مسلک پر متفق ہو جائیں تو یہ شرط نہ کبھی پوری ہوگی نہ اس شرط کے ساتھ دُنیا میں کوئی اسلامی ریاست قائم ہو سکے گی..... "کتاب و سنت" کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔" (ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ بحوالہ ایشیا۔ ۲۳ راگست ۱۹۶۸ء)

ہو، وہ کبھی صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس قانون کو نافذ کرنے والوں کی سیرت صحیح سانچوں میں نہ ڈھلی ہو۔ بنا بریں، وہ قانون سازی کے ساتھ ساتھ، ان انسانوں کی سیرت و کردار پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے جنہوں نے ان قوانین کو عملاً نافذ کرنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے رفقاء کا گروہ بھی ان مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا جن کے مومنِ حقا ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی تھی (۸/۷۴) لیکن مومنین کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ "کبائر الاثم" (بڑے بڑے عیوب و جرائم) سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ معمولی لغزشوں (لمم) کا ان سے امکان ہو سکتا ہے (۵۳/۳۲) اس قسم کی معمولی لغزشیں، عام لوگوں کی صورت میں کوئی خاص مضر اثر پیدا نہیں کرتیں (کیونکہ ان کے اعمال و افعال کا اثر متعدی نہیں ہوتا) لیکن جن ارباب نعم و نسق کے ہاتھ میں لاکھوں (کروڑوں) انسانوں کا حال اور مستقبل ہو اور ان کی قیادت کی اہم ذمہ داری جن کے کندھوں پر ہو، ان کے لئے اس قسم کی عام لغزشوں سے بچنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہ وجہ تھی جو حضرت عمرؓ اپنے ان جلیل القدر رفقاء کی ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے تھے — سب سے پہلے، خود اپنے آپ پر، اور اس کے بعد ان عمالِ حکومت پر۔ صدرِ اوّل کے اسلامی نظام نے جو اس قدر ابد در کنار درخشندہ و تابندہ و تابناک، انسانیت ساز، نتائج پیدا کئے تھے تو اس کی وجہ، قوانینِ حکومت کے مبنی برحق ہونے کے علاوہ، اعیان و ارکانِ حکومت کی پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار بھی تھی اور یہی وجہ تھی جو حضرت عمرؓ ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔

عمال حکومت کے انتخاب کا معیار

قرآن کریم چونکہ اس نظام کا نقطۂ پرکار تھا، اس لئے عمال کے انتخاب میں، قرآنی علم کو بنیادی خصوصیت قرار دیا جاتا تھا۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) مکہ کے گورنر نافع بن عمر بن عبد الحارث آپ سے ملے تو آپ نے پوچھا کہ تم نے اہلِ وادی پر کسے حاکم مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عبد الرحمٰن بن ابزی کو۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ (سابقہ) غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔ پوچھا کہ اُسے کس خصوصیت کی بنا پر حاکم مقرر کیا ہے۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اس کی قرآن پر گہری نگاہ ہے اور فرائض دین کا علم حاصل ہے۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔

(۲) اس واقعہ کو چھوڑ کر سامنے لائیے جس میں ایک شخص نے کہا تھا کہ فلاں آدمی بڑا قابلِ اعتماد ہے تو آپ نے پوچھا تھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ یا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا ہے؟ اور جب اس نے ان سوالات کا جواب نفی میں دیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ پھر تمہیں اس شخص کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ تم نے اُسے مسجد میں اُٹھتے بیٹھتے (نماز پڑھتے) دیکھ لیا اور یہ رائے قائم کر لی کہ وہ بڑا قابلِ اعتماد ہے۔

حسنِ معاملات

یہی معیار آپ عمالِ حکومت کے انتخاب کے سلسلہ میں اختیار فرماتے تھے۔ وہ کسی کے نماز روزے کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ منصب متعلقہ کے لئے اس کی صلاحیت اور حسنِ معاملات کو دیکھتے تھے۔ اور ان صلاحیتوں میں جو بھی سب سے آگے

ہوتا اسے منتخب کرتے تھے، اور اس باب میں کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں کبھی پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے شخص کو گورنر مقرر کر دوں جس سے اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل کوئی دوسرا شخص موجود ہو۔

(۳) انتخاب کے لئے آپ کے اصولوں میں سے ایک اصول ملاحظہ فرمائیے اور پھر آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ آپ جس شخص کو منتخب کرتے تھے وہ کس سیرت و کردار کا حامل ہوتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں سیادت (اعلیٰ منصب) کے لئے ایسے شخص کو منتخب کرنا پسند کرتا ہوں کہ۔

ایک بلند اصول

جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو اپنی قوم کا سردار نظر آئے۔ اور جب اُسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔

کہئے! اس معیار کو دیکھ کر آپ کی نگاہ بصیرت وحید میں آگئی ہے یا نہیں!

(۴) آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

خدا خائن کی قوت اور ثقہ انسان کے عجز (کمزوری) سے بچائے۔

ثقاہت اور قوت

یعنی قوتوں اور صلاحیتوں کا مالک انسان اگر خائن ہے تو وہ بھی خطرناک ہے۔ اور ایک شخص نہایت دیانت دار اور قابل اعتماد ہے لیکن ہے کمزور تو وہ بھی مضرت رساں ہے۔ لہٰذا، انتخاب کا اصول تھا۔ ثقاہت اور قوت۔

(۵) لیکن "قوت" سے مراد سنگدلی اور شقاوت قلبی نہیں تھی۔ عدل کے لئے جرأت و بسالت تھی۔ آپ نے ایک دفعہ ایک شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پروانہ لکھا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا۔ آپ کی گود میں بیٹھ گیا اور آپ نے اسے پیار کیا۔ اس (منتخب شدہ شخص) نے کہا کہ امیرالمومنین! میرے دس بچے ہیں مگر کوئی میرے پاس نہیں پھٹک سکتا۔

شفقت اور محبت

آپ نے کہا۔ کہ اس میں میرا کیا قصور؟ اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں کیا کروں؟ اس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑ دو۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آتا وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا۔

(۶) کسی صوبے کی گورنری کے لئے ایک شخص آپ کے ذہن میں تھا لیکن اس نے ایک دن اگر آپ سے کہا کہ مجھے گورنر تعینات کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے ہی گورنر بنانے والا تھا، لیکن اب نہیں بناؤں گا کیونکہ جو شخص

طلب گار کو نہیں

خود کسی عہدہ کا خواہش مند ہو، اُسے اس عہدہ پر فائز نہیں کرنا چاہیئے۔

(۷) آپ نے نعمان بن عدی کو ایک صوبہ کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے کچھ اشعار آپ کے سامنے آئے جس میں اس نے شاہد و شراب کی وجد آور کیفیات بیان کی تھیں

شاعرانہ

آپ نے اُسے بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ امیرالمومنین! بخدا میں نے آج تک کبھی

شراب کو چکھا تک نہیں۔ یہ تو محض شاعری ہے۔ آپ نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے ہمیں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں تو شاعر تو بہت اچھا ہے لیکن گورنری کے قابل نہیں۔ اس لئے تجھے معزول کیا جاتا ہے۔ (یہ حضرت عمرؓ کے اپنے قبیلے کا آدمی تھا)۔

اشخاص پرستی کے خلاف

(۸) صحابہؓ میں سے جو لوگ زیادہ صاحب اثر تھے آپ انہیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ مدینہ سے باہر نہیں جانے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوچھا کہ آپ ہم لوگوں کو باہر کیوں نہیں جانے دیتے؟ آپ نے فرمایا کہ "اس سوال کا جواب نہ دینا، جواب دینے سے بہتر ہے"۔

اور وجہ ظاہر ہے کہ یہ حضرات باہر جاتے تو نو مسلموں میں شخصیت پرستی شروع ہو جاتی۔

اپنے بیٹے کو گورنر نہیں بنایا

(۹) اہل کوفہ کی طرف سے آپ ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ اگر وہاں کسی نرم مزاج آدمی کو گورنر بنا کر بھیجا جاتا تو وہ اُسے خاطر میں نہ لاتے۔ اگر وہ سخت مزاج ہوتا تو اس کی شکایتیں کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے تنگ آکر کہا کہ اگر مجھے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو نہایت قوی بھی ہو اور امین بھی تو میں اُسے وہاں کا گورنر مقرر کر دوں۔ ایک شخص پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو ایسا آدمی بتاتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے کہا کہ

عبداللہ ابن عمرؓ (یعنی خود آپ کے صاحبزادہ)۔

یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ "خدا تجھے غارت کرے! (اس سے زیادہ اور کیا کہوں!)"۔

اس قدر احتیاط کے بعد، آپ عمال حکومت کا تقرر کرتے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی شخص کے تقرر کے بعد آپ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ آپ ان میں سے ہر ایک پر کڑی نگاہ رکھتے (اس کی تفصیل چند سطور آگے چل کر ملے گی) اور کسی کے متعلق کوئی شکایت سنتے تو اُسے وہاں سے تبدیل کر دیتے۔

تبادلے

اور شکایت کے درست ثابت ہونے پر اُسے معزول کر دیتے۔ آپ کا مقولہ تھا کہ "اگر کوئی حاکم کسی جگہ کوئی زیادتی کرتا ہے اور میں اُسے، اس کا علم ہو جانے کے بعد بھی وہاں سے تبدیل نہیں کرتا تو یہ سمجھئے کہ وہ ظلم و زیادتی گویا خود میں نے کی ہے"۔

فرمایا:-

کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ اگر میں کسی ایسے شخص کو گورنر تعینات کر دوں جو میرے خیال میں تم سب سے بہتر ہو۔ پھر اُسے انصاف کرنے کی تاکید بھی کر دوں، تو کیا میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں گا؟"

لوگوں نے کہا کہ ہاں!

آپ نے فرمایا:-

نہیں! جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ وہ میری ہدایات کے مطابق کام بھی کر رہا ہے یا نہیں میں

اس وقت تک اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔"

(۰)

(۴) ہدایات

عمّال کی تعیناتی کے وقت، اور اس کے بعد بھی، وقتاً فوقتاً آپ جو ہدایات دیتے اور نافذ کرتے رہتے تھے، ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں کس سیرت و کردار کا حامل، اور امورِ مملکت کو کن خطوط پر سرانجام پاتے دیکھنا چاہتے تھے۔ (مثلاً)

(۱) آپ جب کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تو فرماتے:۔

یاد رکھو! میں تم لوگوں کو مستبد اور ظالم بنا کر نہیں بھیج رہا۔ بلکہ رعایا کا راہ نما (امام) بنا کر بھیج رہا ہوں۔ کبھی کسی بے قصور کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہو جائے اور کبھی کسی کی بے جا تعریف نہ کرنا کہ وہ مچل جائے۔ لوگوں کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے سہولتیں مہیا کرنا۔

(۲) آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا:۔

اپنی مجلس میں لوگوں کو مساوی درجہ دو تاکہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے نا امید نہ ہو جائے اور صاحبِ منصب اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(۳) جب کسی حاکم کے متعلق سنتے کہ وہ مریضوں کی عیادت کے لئے نہیں جاتا اور صاحبِ احتیاج اس کے پاس آنے سے گھبراتے ہیں تو آپ اُسے برخاست کر دیتے۔

(۴) حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کے نام ایک خط میں لکھا:۔

یاد رکھو! لوگوں کے معاملات وہی سنوار سکتے ہیں جن کا عزم راسخ ہو اور وہ کسی سے دھوکا نہ کھائیں۔

نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے

ضمناً، ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ بات مکمل کرو۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ دھوکا کھاتا ہے۔

(۵) ہر عامل سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ (۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا (کہ اس میں رعونت اور نخوت پائی جاتی ہے (۲) باریک کپڑے نہیں پہنے گا۔ (۳) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔ (۴) اپنے دروازے پر دربان نہیں بٹھائے گا۔ (۵) اہلِ حاجت کے لئے اپنا دروازہ کھلا رکھے گا۔ یہ شرائط تقرری کے پروانے میں درج کر دی جاتی تھیں اور انہیں مجمع عام میں پڑھ کر بھی سُنا دیا جاتا۔

(۶) آپ نے ایک دفعہ اپنے عمّال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

یاد رکھو! رعیت اس وقت تک امام کی پیروی کرتی ہے جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے جب

وہ احکام خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو رعایا اس کے احکام سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ فسق و فجور اختیار کر لیتا ہے تو رعایا اس سے بڑھ کر فاسق و فاجر ہو جاتی ہے۔

(۷) ایک وقت ایک شخص نے آپ کی اور حضرت عثمانؓ کی دعوت کی۔ جب وہاں سے واپس آئے تو آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ کاش! میں یہ دعوت قبول نہ کرتا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا: "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ دعوت اس لئے نہ کی گئی ہو کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ دیکھو! میں کتنا بڑا آدمی ہوں جس کے گھر اتنے بڑے لوگ کھانے کے لئے آتے ہیں"۔ اسی بنا پر وہ عمالِ حکومت کو بھی دعوتیں قبول کرنے سے روکا کرتے تھے۔

(۸) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کسی جھگڑے میں

عصبیتِ جاہلیہ کے خلاف

قبیلہ ضبہ نے اپنے امیر کی طرف رجوع کرنے کے بجائے، آلِ ضبہ (اپنے قبیلہ) کو مدد کے لئے پکارا تھا۔ یاد رکھو! جب کوئی شخص اپنے قبیلے کو آواز دے تو سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اس سے عہدِ جاہلیت کی قبائلی عصبیت جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، پھر سے بیدار ہو جائے گی۔ اس رجحان کو سختی سے روکو۔ اب اگر وہ دو ہی ہونگے ظالم (زیادتی کرنے والا) اور مظلوم۔ اور مظلوم صرف امیر کو مدد کے لئے پکارے۔

(۹) حضرت عمرو بن عاصؓ کو ایک خط میں لکھا — اور غور سے سنئے کہ کیا لکھا — لکھا کہ

تم اپنی رعایا کے لئے ایسے ہی بن جاؤ جیسے تم اگر رعایا ہو تو چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

(۱۰) آپ نے سپہ سالاروں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جنگ کے دوران کسی کو سزا نہ دو، مبادا وہ دشمن کے ساتھ جا ملے۔

(۱۱) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو (جب وہ بصرہ کے گورنر تھے) لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم عوام کے ہجوم کو ایک ساتھ بلا لیتے ہو۔ مساوات بے شک اپنی جگہ ہے لیکن اہل علم و دیانت کی قدر افزائی بھی ضروری ہے۔ اس لئے قرآن دان اور صاحب دیانت لوگوں کو پہلے بلا لیا کرو۔ (ایسا کرنا علاوہ ان حضرات کی قدر افزائی کے، دوسروں کے دل میں قرآن دانی اور دیانت کا شوق پیدا کرے گا۔)

(۱۲) ایک اور قول سنیے اور جھوم جائیے۔ فرمایا :-

نرمی بلا ضعف - سختی بلا جبر

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں، اور جس میں سختی ہو، لیکن استبداد کی بنا پر نہیں — بلا ضعف نرمی، اور بلا جبر قوت — یہ ہے اصل الاصول۔

(۱۳) حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا تو کہا کہ

مغیرہؓ! ایسا بن کر رہنا کہ پُر امن تجھ سے بے خوف رہیں، اور بدمعاش خوف زدہ۔

(۱۴) ایک اور وجد آفریں قول — فرماتے ہیں :-

وجد آفریں قول

جو شر پیدا کر کے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔
جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمیر بن سعدؓ نے حمص میں منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا کہ

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مواخذہ کرنا ہے۔

حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا۔ اے کاش! عمیرؓ جیسا آدمی میرے قریب ہوتا تو میں اس سے مسلمانوں کے کتنے کام لیتا۔

(۱۵) ایک دفعہ عراق کا ایک وفد آیا جس میں حضرت احنف بن قیسؓ بھی تھے۔ سخت گرمی کا دن تھا۔ دیکھا کہ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے بیت المال کے ایک اونٹ کو تیل مل رہے ہیں اور اپنی قبا کو لپیٹ کر سر پر بطور عمامہ باندھ رکھا ہے۔ وفد کو دیکھا تو فرمایا:

احنفؓ! کپڑے اتار کر آجا اور میری مدد کر۔ یہ بیت المال کا اونٹ ہے جس میں یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کا حق ہے۔

ایک شخص نے کہا۔ — امیر المومنین! آپ کسی غلام (خادم) سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ یہ کام کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اور احنف سے بڑا غلام کون ہو گا۔

اور اس کے بعد وہ انقلاب آفریں فقرہ ارشاد فرمایا جس کے لئے ہم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ کہا:-

غلام کی طرح مخلص اور امین

جو شخص مسلمانوں کا والی بنے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔

(۱۶) عام ہدایات یہ تھیں:

کھردرے بنو اور مجیوں کی طرح نازو انداز نہ کرو۔ اپنے آپ کو ان کے لباس سے بھی بچاؤ، کہ وہ تمہیں آرام طلب بنا دے گا۔ سخت بنو۔ چھوٹا موٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو۔ پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب فربہ کرو۔ ڈٹ کر گھوڑ سواری کرو، اور جم کر تیر اندازی کی مشق کرتے رہو، ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے۔ اس لئے کبھی تکلف نہ کرو۔ دین میں تفقہ حاصل کرو۔ کتاب کے ظرف اور علم کے سرچشمے بنو۔ سیادت و قیادت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو پہلے سمجھ پیدا کرو۔ جس میں تکبر دیکھو سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

(۱۷) اور آخر میں وہ ہدایت، جس میں تمام ہدایات سمو جاتی ہیں۔ فرمایا:-

محاسبۂ خویش

اپنا محاسبہ آپ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ کیوں کہ محاسبۂ خویش تمہارے حساب کتاب کو آسان کر دے گا۔

اپنے آپ کا وزن کرتے رہو قبل اس کے کہ تمہارے لئے میزان کھڑی کی جائے۔ اپنے آپ کو "عرض

اکبر (عدالت کی بڑی پیشی) کے لئے تیار رکھو جس دن تمہاری کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہے گی۔
آیئے — ہم دیکھیں کہ یہ محاسبہ کس طرح ہوا کرتا تھا۔ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔

(۵) احتساب

مقبوضات کی فہرست

احتساب کا پہلا قدم یہ تھا کہ ہر عامل کی تقرری کے وقت اس کے مقبوضات کی فہرست مرتب کر لی جاتی، اور اسے وقتاً فوقتاً چیک کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی التزام یہ تھا کہ ہر عامل کو اتنا دیا جائے جس سے اس کی اور اس کے متعلقین کی ضروریات باطمینان پوری ہوتی رہیں (تفصیل اس کی معاشی نظام میں ملے گی)۔

(۲) آپ نے احکام جاری کر رکھے تھے کہ کوئی گورنر مدینہ آئے تو دن کے وقت آئے اور لوگوں کے سامنے شہر میں داخل ہو۔ رات کے وقت نہ آئے۔

(۳) یہ احتساب مال تک محدود نہیں تھا۔ عمّال کے رہن سہن، طرزِ بود و ماند، تمدن و معاشرت اخلاق عامہ، غرضیکہ ان کی ہر نقل و حرکت پر آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ مصر کے گورنر (حضرت) عیاض بن غنمؓ کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے۔ ان کے خلاف شکایت یہ تھی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں، اور انہوں نے دربان

راعی کی ذمہ داری

مقرر کر رکھا ہے۔ شکایت کے صحیح ثابت ہونے پر آپ نے ان سے کہا کہ یہ لو، اُون کا جُبّہ پہنو۔ ایک عصا لو اور بیت المال کی تین سو بکریاں چراؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ راعی (گڈریا) کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے۔

حمص کے گورنر (حضرت) عبداللہؓ بن قرط کے خلاف یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اپنے رہنے کے لئے بالاخانہ بنوا لیا تھا جس کی اجازت نہیں تھی۔ بالاخانہ کو تو آپ (حضرت عمرؓ) نے آگ لگوا دی اور گورنر کو ایک جبّہ پہنوا کر، ہاتھ میں ایک ڈول دیا اور کہا کہ بیت المال کے اونٹوں کو پانی پلایا کرو اس سے، دماغ سے تفاخر کی بُو نکل جائے گی۔

(۴) فاتحِ مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے جس نے ایک قبطی کو بلا وجہ پیٹ دیا تھا۔ آپ نے اس قبطی کے ہاتھوں اُسے کوڑے لگوائے تھے۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ خود (حضرت) عمرو بن عاصؓ کے بھی ایک آدھ تازیانہ لگا دیا جائے جس نے اپنے بیٹے کی صحیح تربیت نہیں کی۔

مدافعت کا موقعہ دیا جاتا

(۵) شکایت سننے پر یونہی اندھا دھند مؤاخذہ نہیں کر لیا جاتا تھا۔ شکایت کی پوری پوری چھان بین کی جاتی اور جس کے خلاف شکایت ہوتی اُسے اپنی مدافعت کا موقعہ دیا جاتا۔ لوگوں نے حمص کے گورنر (حضرت) سعید بن عامرؓ کے خلاف چار شکایتیں کیں۔ (۱) وہ دن چڑھے تک گھر سے نہیں نکلتے۔ (۲) رات کے وقت کسی کی پکار

نہیں سُنتے۔ (۳) مہینہ میں ایک دن بالکل باہر نہیں آتے۔ اور (۴) کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جیسے ان پہ سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے سعید سے پوچھا کہ پہلی شکایت کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ انہوں نے کہا۔ بخدا مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میں اس بات کو عام کروں لیکن آپ پوچھتے ہیں تو مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میری بیوی کے پاس کوئی خادمہ نہیں ہیں نے اس کا کچھ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ صبح اُٹھ کر آٹا گوندھتا ہوں اس کے خمیر ہونے تک انتظار کرتا ہوں۔ پھر روٹی پکاتا ہوں۔ زاں بعد وضو کر کے باہر آتا ہوں۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ رات کے وقت باہر نہیں آتے۔ آپ نے جواب میں کہا کہ میں یہ راز بھی سربستہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اُسے بھی کھولنا پڑا۔ میں نے دن رعایا کے لئے اور رات اللہ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

تیسری شکایت یہ ہے کہ میں مہینے میں ایک دن باہر نہیں نکلتا۔ سو میرے پاس خادم نہیں جو میرے کپڑے دھوئے، نہ ہی کپڑوں کا کوئی فالتو جوڑا ہے۔ مہینے میں ایک دن کپڑے دھوتا ہوں اور ان کے خشک ہونے تک انتظار میں بیٹھا رہتا ہوں۔

اب رہا چوتھا الزام کہ مجھ پہ کبھی کبھی سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ تو یہ بات ذرا لمبی ہے۔ اس میں مجھے عمر رفتہ کو آواز دینی پڑے گی۔ مکہ میں مشرکین نے حضرت خبیبؓ انصاری کو گرفتار کر لیا اور ان کی بوٹیاں اڑا کر انہیں کھجور کے تنے کے ساتھ لٹکا دیا۔ اور پوچھا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ اس وقت تیری جگہ محمدؐ ہوتا؟

انہوں نے جواب دیا کہ ملعونو! تم یہ کیا کہتے ہو۔ میں تو اسے بھی پسند نہیں کر سکتا کہ میں آرام سے رہوں اور حضورؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے۔ اس پر قریش نے انہیں سخت اذیت دے کر صلیب دی۔

جب کبھی مجھے وہ دن یاد آجاتا ہے تو کانپ اُٹھتا ہوں کہ خدا میرا یہ گناہ کبھی نہیں بخشے گا کہ میں نے اپنے سامنے یہ سب کچھ ہوتے دیکھا اور خبیبؓ کی کوئی مدد نہ کی۔ میں ان دنوں مشرک تھا۔ خدا پہ ایمان نہیں رکھتا تھا۔ بایں ہمہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک مظلوم کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ جب اپنے اس گناہ کا احساس غالب آجاتا ہے تو مجھ پہ سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

یہ تھے اس دور کے گورنر۔ اور اس کے باوجود، سربراہ مملکت ان کی رفتار گفتار، کردار پہ کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ شکایتوں کی تحقیق و تفتیش سرِ عام (پبلک کے سامنے) ہوتی تھی، اور الزام صحیح ثابت ہونے پہ، سزا بھی پبلک میں دی جاتی تھی۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ اس طریق کار کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ اس طرح عمالِ حکومت بددل ہو جائیں گے اور رعایا کی ان کے خلاف جرأتیں بڑھ جائیں گی۔ اس پہ آپ نے فرمایا تھا کہ جو عامل انصاف کا تقاضا پورا کرنے پہ بددل ہوتا ہے۔ وہ منصب حکومت کے قابل ہی نہیں۔ باقی رہا سزا کا پبلک میں دیئے جانا تو یہ

سرِ عام سزا

قرآن کریم کے ارشاد کے عین مطابق ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ سزا پبلک میں دی جائے اور اس باب میں ذرا سی بھی نرمی نہ برتی جائے۔ (۲۴/۲)

ہمارا ہر عمل عوام کے لئے سند بن جاتا ہے

آپ عمالِ حکومت کے بارے میں اس قدر سختی کیوں برتتے تھے، اس کی وجہ بھی آپ نے بیان فرما دی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ حضرت طلحہؓ طواف میں رنگا ہوا کپڑا پہنے تھے۔ آپ نے کہا کہ طلحہؓ! طواف میں رنگ دار کپڑا، چہ معنی دارد؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو مٹی کا رنگ ہے۔ آپ نے فرمایا "طلحہؓ! دوسرے لوگوں کی نسبت آپ حضرات کو بہت زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کے امام ہیں جن کی اقتداء عوام کرتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل آپ کو دیکھے گا تو وہ اپنے لوگوں سے کہے گا کہ میں نے حضرت طلحہؓ کو بحالت طواف رنگ دار کپڑا پہنے دیکھا تھا۔ یوں تمہارا یہ معصوم سا عمل لوگوں کے لئے سند بن جائے گا۔ لہٰذا ہم لوگوں کو بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔

اور یہی وجہ تھی کہ آپ ان ذمہ دار حضرات کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی مؤاخذہ کرتے تھے۔

خود اپنا محاسبہ

لیکن دوسروں کا محاسبہ اور مؤاخذہ کرنے سے پہلے، امیر المومنین خود اپنا محاسبہ کرتے اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے مؤاخذہ کے لئے پیش کرتے تھے۔ واقعہ مشہور ہے کہ یمنی چادریں آئیں تو آپ نے سب کو ایک ایک چادر دے دی۔ ایک دن آپ منبر پر تشریف لائے اور حسب معمول مجمع سے کہا کہ — اسمعوا و اطیعوا "سنو جو کچھ میں کہتا ہوں اور پھر اس کی اطاعت کرو"

یمنی چادریں

مجمع میں سے آواز آئی — "ہم نہ تمہاری سنیں گے، نہ اطاعت کریں گے" — کہنے والے حضرت سلمان فارسیؓ تھے۔ سربراہِ مملکت منبر سے نیچے اتر آئے اور کہا کہ ابو عبداللہ! کیا بات ہے؟"

کہا "عمرؓ! تم نے دنیا داری برتی ہے۔ تم نے ایک ایک چادر تقسیم کی تھی، اور خود دو چادریں پہن کر آئے ہو!"

فرمایا۔ عبداللہ بن عمرؓ کہاں ہے؟

حاضر ہوں! امیر المومنین!

فرمایا۔ بتاؤ۔ ان میں سے ایک چادر کس کی ہے — عرض کیا میری ہے۔ امیر المومنین!

آپ نے حضرت سلمانؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ابو عبداللہ! تم نے جلدی کی جو بات پوچھے بغیر احتجاج کر دیا۔ میں نے اپنے پہلے کپڑے دھوئے تھے۔ باہر آنے کے لئے ایک چادر کافی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے (اپنے بیٹے) عبداللہ سے چادر مانگ لی تھی۔

(حضرت) سلمانؓ نے کہا۔ ہاں! اب کہئے۔ یا امیر المومنین! ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے

آپ خود اپنا یہ قول کیسے بھول سکتے تھے کہ

رعیت اس وقت تک امیر کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ خدا کی اطاعت کرتا رہے۔

(حضرت) معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دینے لگے۔ تو

ایک درہم

توکوڑے میں سے ایک درہم (اس وقت کا کم از کم سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہ پہنچا ہی تھا کہ امیر المومنین کا بلاوا آگیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیبؓ! میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا! تم سوچو کہ قیامت کے دن جب امت محمدیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔

ایک شخص نے آپ سے بھرے مجمع میں کہا کہ عمرؓ! خدا سے ڈر۔ وہ بار بار اس جملہ کو دہراتے

عمرؓ! خدا سے ڈر

چلا گیا۔ تو مجمع میں سے ایک شخص نے اس سے کہا کہ اب بس بھی کرو تم بہت کہہ چکے۔ حضرت عمرؓ نے اسے روکا اور کہا کہ نہیں! اسے کہنے دو۔ اگر لوگ ایسی بات نہ کہیں تو سمجھ لو کہ ان میں خیر کا ذرہ تک نہیں رہا۔ اور اگر ہم اسے نہ سنیں تو سمجھ لو کہ ہم میں خیر کی رمق تک نہیں رہی۔

ایک دن آپ نے برسر منبر کہا کہ صاحبو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ تلوار نیام سے نکالی اور کہا کہ ہم تمہارا سر اڑا دیں گے۔ آپ نے اسے آزمانے کے لئے کہا کہ کیا تو میری شان میں یہ بات کہتا ہے؟ اس نے نہایت سکون سے کہا کہ ہاں! تمہاری شان میں۔

خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو

آپ نے فرمایا کہ الحمدللہ! قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر عمرؓ بھی کج رو ہو جائے تو وہ اس کا سر اڑا دیں۔

اور "یہ سر اڑا دینے کی بات" تو خود آپ ہی نے انہیں بتائی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک ٹھیک چلے تو لوگوں کو چاہیئے کہ اس کی اطاعت کریں۔ لیکن اگر وہ غلط راستہ اختیار کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے۔

حضرت طلحہؓ پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیوں نہ کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو اسے معزول کر دینا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا۔۔۔ "نہیں! قتل کر دینا بعد میں آنے والوں کے لئے زیادہ عبرت ناک ہو گا۔"

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی نظام میں ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی دانست میں سمجھے کہ خلیفہ غلطی کر رہا ہے تو وہ اٹھ کر اس کا سر اڑا دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن جرائم کی سزا موت ہے اگر وہ خلیفہ سے بھی سرزد ہوں تو اسے بھی وہی سزا دینی چاہیئے اس باب میں سربراہ مملکت اور عام لوگوں میں فرق نہیں کرنا چاہئے۔

لیکن حضرت عمرؓ یہ بھی جانتے تھے کہ سربراہ مملکت کا احتساب اس کی ذات تک محدود نہیں ہونا چاہیئے

اہل وعیال کا احتساب

اس میں اس کے اہل وعیال بھی برابر کے شریک ہونے چاہئیں۔ قرآن کریم نے جو بعض بیوی بچوں کو انسان کا دشمن (۶۴/۱۴) اور مال اور اولاد کو فتنہ (۶۴/۱۵) کہا ہے تو یہ خطرناک گھاٹی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچ گئے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دُگنی سزاؤں کا باب تمہیں اختیار ہے، جو چاہے حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔

اور یہ "دُگنی سزا" کا فیصلہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ازدواج مطہراتؓ سے کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تم میں سے جو کسی جرم کی مرتکب ہوگی اُسے دُگنی سزا ملے گی (۳۳/۳۰) حضرت عمرؓ نے اپنے ارشاد گرامی سے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ قرآن کا وہ حکم، مملکت اسلامیہ کے ہر سربراہ پر یکساں عاید ہوتا ہے۔

یہ تھا مملکت کی ذمہ داریوں کا احساس جس کے پیش نظر آپ نے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) مصر کے قاصد (حضرت) معاویہ بن خدیجؓ سے کہا تھا کہ تم نے خیال کیا کہ دوپہر کا وقت ہے۔ امیر المومنین اس وقت قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔

ذمہ دار کو نیند کہاں؟

معاویہؓ! جس کے ذمے مملکت کے فرائض ہوں، دن تو ایک طرف اسے رات کے وقت بھی نیند نہیں آ سکتی۔

ذمہ داریوں کا احساس

اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس پر نگاہ رکھتے ہوئے حضرت عباسؓ نے اس شخص کے سوال پر کہ حضرت عمرؓ کیسے تھے۔ جواب میں کہا تھا کہ:

وہ اس خوف زدہ پرندے کے مانند تھے جسے ہر طرف جال ہی جال نظر آ رہے ہوں۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک سفر میں، میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا۔ وہ راستہ میں ایک باغ کے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے پس دیوار کان لگا کر سنا تو آپ کہہ رہے تھے:

خطاب کا بیٹا عمر اور امیر المومنینؓ۔ اللہ اکبر! خطاب کے چھوکرے۔ اللہ سے ڈر کر رہ۔ ورنہ وہ تجھے ہلاک کر دے گا۔

ایک دن آپ نے اعلان کیا کہ "الصلوٰۃ جامعہ" لوگوں نے حسب معمول سمجھا کہ کوئی اہم معاملہ درپیش ہے جس کے لئے اجتماعی اعلان ہوا ہے۔ وہ جمع ہوئے تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

اے لوگو! میں اپنی مخزومی خالاؤں کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور ان کا پانی بھرا کرتا تھا جس کے عوض وہ مجھے مٹھی بھر چھوارے دے دیا کرتی تھیں۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ امیرالمومنین! ہم سمجھے نہیں کہ اس اجتماع اور اعلان کا مطلب کیا تھا؟ فرمایا۔ آج میں تنہا بیٹھا تھا کہ دل نے کہا کہ تو امیرالمومنین ہے۔ تیرے اور اللہ کے درمیان کوئی قوت نہیں۔ تجھ سے افضل کون ہو سکتا ہے۔ اس پر میں کانپ اٹھا اور کہا کہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنے نفس کو بتا دوں کہ وہ ہے کیا؟ اس اجتماع اور خطاب سے یہی مقصد تھا۔

ایک دن حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بیت المال کے اونٹوں کا جائزہ لینے کے لئے گئے۔ حضرت عمرؓ اونٹوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے احوال و کوائف بولتے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ سن سن کر حضرت عثمانؓ کو املا کراتے جاتے تھے اور وہ انہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھے لکھتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے تھے۔ دھوپ سخت تھی لیکن وہ کام میں ایسے منہمک تھے کہ انہیں اس کی شدت کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ نے قرآن مجید میں حضرت شعیبؑ کی بیٹی کا یہ قول پڑھا ہوگا جس نے کہا تھا کہ يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (۲۸/۲۶) "ابا جان! اسے (حضرت موسیٰؑ کو) ملازم رکھ لیجئے

اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْن

کیوں کہ بہترین خدمت گزار وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امین بھی"! حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔ یہ ہے قوی الامین۔

اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْن۔ ان دو لفظوں میں حضرت عمرؓ کی ساری شخصیت سمٹ کر آجاتی ہے۔

اس دور کے عمّال حکومت جو اس قدر امین تھے تو اس کا راز بھی اسی میں تھا کہ سربراہِ مملکت خود امین تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے مالِ غنیمت مدینہ بھیجا۔ تو زر و جواہرات کی اس قدر کثرت اور نوادرات کے ایسے تنوع کو دیکھ کر اہلِ مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ حضرت سعدؓ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ امیرالمومنین! یہ مال و متاع اس قدر وجۂ تعجب اور باعثِ مسرت نہیں جس قدر یہ امر کہ جب ہم نے یہ شہر فتح کئے ہیں تو یہ تمام زر و جواہرات آپ کی فوج کے سپاہیوں کے سامنے پڑے تھے اور کوئی باہر کا دیکھنے والا بھی نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہیں

جیسا سربراہ ویسے عمّال

رکھی۔ سارے کا سارا مال لا کر مرکز میں ڈھیر کر دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو بھر آئے۔ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ فرمایا کہ :۔

ابن خطاب! تمہارے سپاہی اس لئے امین ہیں کہ تم امین ہو۔

یہ تھا سارا راز اس دور کی حکومت کی درخشندگی اور تابندگی کا ۔۔۔ اس دور میں سربراہِ مملکت کا فریضہ مملکت کے انتظام کی درستگی ہی نہیں تھا۔ اس کا فریضہ حکومت کے اعضاء و جوارح کی سیرت و کردار کی درستگی بھی تھا ۔۔۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس کا اوّلین فریضہ ارکانِ حکومت کی سیرت و کردار کی درستگی تھا۔ انتظام کی درستگی، ان کی سیرت کی درستگی کا فطری نتیجہ تھا۔

"سمیع و بصیر"

اور اس حسن عمل اور درستگیٔ نظم و نسق کا راز یہ تھا کہ سربراہ مملکت تمام رعایا کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔ ایک شخص نے آپ کے ایک پڑوسی سے دریافت کیا کہ امیر المومنین تک پہنچنے کی کیا سبیل ہے؟

ہر ایک کی رسائی

اس نے کہا کہ نہ تو ان کے گھر پر کوئی پھاٹک ہے، نہ وہ پس پردہ بیٹھتے ہیں۔ وہ نماز پڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر جو چاہتا ہے ان سے باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

یہ تو رعایا کا امیر المومنین تک پہنچنا تھا لیکن امیر المومنین خود رعایا تک پہنچتا تھا۔ وہ بازاروں میں پھرتے، رعایا کے معاملات کا خود مشاہدہ اور مطالعہ کرتے۔ ضروری امور کا فیصلہ وہیں بر سر موقعہ کر دیتے زیادہ اہم معاملات مجلس مشاورت میں پیش کر دیتے۔ دن کے وقت فرصت کم ملتی تو راتوں کو گشت کرتے اور بغیر کسی کو علم ہوئے رعایا کے حالات براہ راست معلوم کرتے کتب تاریخ میں اس گشت کے بڑے دلچسپ اور سبق آموز واقعات مذکور ہیں۔ (مثلاً) (۱) ایک دفعہ ایک قافلہ آیا اور شہر سے باہر اترا۔ اس کی خبر گیری کے لئے خود تشریف لے گئے۔ گشت لگائے پھر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اُدھر گئے اور اس کی ماں کو تاکید کی کہ وہ بچے کو بہلائے تھوڑی دیر بعد پھر ادھر سے گزرے

بچہ رو رہا تھا

تو بچے کو روتے پایا۔ سخت غصہ کے عالم میں اس کی ماں سے کہا کہ تم بڑی بے رحم ماں ہو۔ اس نے کہا کہ راہرو! تمہیں حقیقت کا علم نہیں اور مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دے رکھا ہے کہ بچوں کا وظیفہ اس وقت سے شروع کیا جائے جب وہ دودھ چھوڑ دیں۔ میں اس کا دودھ چھڑاتی ہوں۔ اور یہ روتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کو سخت رقت ہوئی اور کہا کہ ہائے عمرؓ! نہ معلوم تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔ اُسی دن منادی کرا دی کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

(۲) آپ کے خادم اسلمؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کے وقت گشت کو نکلے۔ شہر کے باہر ایک مقام پر دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں حقیقت حال معلوم

خالی ہانڈی چڑھا رکھی تھی

کرنے پر اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ حضرت عمرؓ اُٹھے۔ بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دیجئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے۔ اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اُٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اُٹھانے دو۔ یہ چیزیں لاکر اس عورت کو دیں۔ اس نے ہانڈی چڑھائی تو آپ چولھا پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے سیر ہو کر کھایا اور

اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ امیرالمومنین ہونے کے قابل تم تھے۔ نہ کہ عمرؓ!

فی الحقیقت امیرالمومنین ہونے کے قابل یہی تھے۔

(۳) اسی طرح ایک رات گشت میں ایک بدو کے پاس، اس کے خیمے سے باہر بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ دفعتہً خیمہ سے رونے کی آواز آئی۔ آپ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میری بیوی دردِ

بدو کی بیوی

زہ میں مبتلا ہے اور اس وقت کوئی عورت پاس نہیں۔ آپ خاموشی سے اُٹھے۔ گھر آئے۔ اپنی زوجہ محترمہ اُمّ کلثومؓ (حضرت علیؓ کی صاحب زادی تھیں) کو ساتھ لیا اور بدو کی اجازت سے انہیں خیمہ کے اندر بھیج دیا۔ اور خود باہر بدو سے باتیں کرنے لگ گئے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے باتیں کر رہا ہے کہ اندر سے اُمّ کلثوم کی آواز آئی: "امیرالمومنین! اپنے دوست کو بچے کی مبارک باد دیجئے۔"

امیرالمومنین!! ... یہ سُن کر بدو کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ آپ نے اُسے مبارک باد دی اور فرمایا کہ کل میرے پاس آنا تاکہ اس بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

(۴) اور اسی گشت کی ایک شبِ تاریک میں آپ کو وہ گوہرِ تابدار مل گیا جس نے کاشانۂ فاروقیؓ کو بقعۂ نور بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو دودھ میں پانی ملانے سے منع کرتے تھے۔ ایک رات آپ

دودھ میں پانی نہ ملانے والی لڑکی

گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک مکان کے باہر اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سُنا تو اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ اٹھو۔ اور دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔

اس نے کہا ـــ اماں! تمہیں معلوم نہیں کہ امیرالمومنین نے دودھ میں پانی ملانے سے شدت سے منع کر رکھا ہے۔

ماں نے کہا ـــ اُٹھ۔ اور دودھ میں پانی ڈال۔ اس جگہ کوئی سا امیرالمومنین تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بیٹی نے کہا ـــ اماں! امیرالمومنین نہیں دیکھ رہا ـــ تو وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم امیرالمومنین ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صبح ہوئی تو آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جلدی سے جا اور دیکھ کہ وہ لڑکی شادی شدہ ہے یا ابھی اس کی شادی ہوتی ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اُسے سمجھا بجھا کر گھر لے آ کہ اس قسم کی نعمتیں روز روز نہیں ملا کرتیں ـــ معلوم ہوا کہ لڑکی بیوہ ہے آپ نے اپنے بیٹے عاصم سے اس کی شادی کر دی۔

اسی لڑکی کی اولاد سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا ہوئے تھے جنہوں نے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی تھی ـــ اسی نسبت سے آپ (حضرت عمرؓ) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نانا کہلاتے ہیں۔

(۵) ایک دفعہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے کہ دیکھا کہ ایک آدمی بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے۔ اس سے کہا کہ میاں! دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔ دوبارہ ادھر گئے تو وہ پھر بھی بائیں ہاتھ ہی سے کھا رہا تھا۔

ذرا سختی سے کہا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اس نے کہا کہ میرا دایاں ہاتھ کام آچکا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی جہاد میں اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ افسوس ہے تمہیں وضو کون کراتا ہوگا۔ سر کون دھوتا ہوگا۔ کپڑے کون پہناتا ہوگا۔ پھر ایک ملازم مقرر کر دیا کہ اس کے ضروری کام کر دیا کرے۔

یہ تھا رعایا کے افراد پر سربراہ کی نگاہ کا عالم!

ہمارا حاکم اور ہماری حالت سے بے خبر!

(۶) اس عورت کے واقعہ میں جو خالی ہانڈی چولھے پر چڑھائے بھوکے بچوں کو بہلا رہی تھی، ہم نے ایک کڑی دانستہ چھوڑ دی تھی۔ جب اس نے کہا تھا کہ بچوں کو تین دن سے کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ تو آپ نے اس سے کہا تھا کہ تم نے امیر المومنین کو اس کی اطلاع دی تھی؟ اس کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا تھا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس دور میں عام عورتوں تک، حکومت کی ذمہ داریوں کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بے خبر رہے، اس تک شکایت پہنچانے سے کیا حاصل؟

شام کے ویرانے کی بڑھیا

(۷) اور یہیں سے ہمارے سامنے وہ واقعہ آجاتا ہے کہ جب بھی عمرؓ اسے یاد کرتے، آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ آپ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا ——— ویرانے میں ایک خیمہ! قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے پوچھا کہ تمہیں کچھ عمرؓ کا بھی حال معلوم ہے؟ اس نے کہا کہ سنا ہے وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؟ آپ نے کہا کہ تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی؟ اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں تھا۔ عمرؓ کا کام تھا۔ آپ نے کہا کہ عمرؓ کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا کہ

اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے، مجھے شام کی اس بڑھیا نے بتایا۔

خداوندا! خدائی دردِ سر ہے۔

اسی کا احساس تھا کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا۔ کیوں کہ دور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمال، ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔ میں شام، جزیرہ، مصر، بحرین، بصرہ، جاؤں گا اور ہر

> مقام پہ دو دو ماہ قیام کرکے لوگوں کے حالات براہ راست معلوم کروں گا۔

لیکن عمر نے ایفائے کی اور اس دورہ کا موقعہ ہی نہ ملا۔

ظاہر ہے کہ جب ان کی اپنی یہ حالت تھی تو اپنے عمال کو کس قدر سخت تاکید نہیں کرتے ہوں گے کہ وہ لوگوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ (حضرت) عیاض بن غنم رض کو اس "جرم" کی پاداش میں کہ انہوں نے اپنے دروازے پہ دربان بٹھا دیا تھا، کیسی عبرت آموز سزا دی تھی۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رض کے مکان کے سامنے بازار تھا۔ جس سے ہر وقت شور و شغب کی آواز آتی رہتی تھی۔ آپ نے اس طرف کا دروازہ بند کر دیا۔ حضرت عمر رض کو معلوم ہوا تو آپ نے محمد بن مسلمہ رض (انسپکٹر امور عامہ) کو بلا کر کوفہ روانہ کیا اور کہا کہ جا کر سعد رض کے دروازے کو آگ لگا دے۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو خط حضرت سعد رض کو لکھا تھا اس میں کہا تھا کہ

> جس محل کے دروازے عوام پہ بند ہو جائیں، وہ قصرِ سعد رض نہیں، قصرِ فساد ہے۔ اس کا منہدم ہو جانا ہی بہتر ہے۔

آپ نے گورنروں کے نام تاکیدی احکام نافذ کر رکھے تھے کہ

> وہ پردوں کے پیچھے چھپ کر نہ بیٹھیں۔ عوام کے سامنے بیٹھیں۔ اپنا حق وصول کریں۔ ان کے حقوق کی ادائیگی کریں۔

حج کی تقریب پر شکایات

یہ تو سال بھر کا معمول تھا۔ اور سال کے بعد حج کا اجتماع ہوتا تھا جس میں لاکھوں افراد شریک ہوتے تھے۔ اس میں آپ تمام صوبوں کے گورنروں کو بلاتے۔ دوسری طرف ملک میں عام اعلان کیا جاتا کہ جسے کسی کے خلاف کوئی شکایت ہو وہ اس اجتماع میں آ جائے۔ وہاں شکایات سنی جاتیں۔ پیشی ہوتی۔ اور جس کے خلاف شکایت صحیح ثابت ہوتی اُسے لاکھوں کے اجتماع میں سزا دی جاتی یا سرزنش کی جاتی۔

یہ تھا امیر المومنین، حضرت عمر فاروق رض کا رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کا طریق اور معمول۔ سچ ہے۔ جو خدائے سمیع و بصیر و خبیر کے نام پہ لوگوں سے اطاعت لے، اسے خود ایسا ہی (بحدِ بشریت) سمیع و بصیر و خبیر ہونا چاہئے۔ یہی صحرائے شام کی اس بڑھیا نے کہا تھا کہ

> اگر عمر رض کے پاس رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کا انتظام نہیں تو اسے چاہئے کہ حکومت چھوڑ دے۔

ان مقامات پر رہ رہ کر میرے جی میں آتا ہے کہ میں فاروق اعظم رض کی اس بات کو بھی نوکِ قلم پہ لے آؤں جس کے تصور سے رہگذرِ خیال روشِ صد بہار ہو جاتا ہے لیکن کوئی جذبہ ہے جو غیر شعوری طور پہ یہ کہہ کر میرا ہاتھ روک دیتا ہے کہ — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

شاہکارِ رسالتؐ

عمر فاروقؓ

تیسرا ایڈیشن

اکثر سوالات اُبھرتے ہیں کہ

- اسلام کا معاشرتی۔ تمدنی۔ عسکری۔ سیاسی۔ معاشی نظام کیا ہے؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم ہوا تھا؟
- اگر قائم ہوا تھا تو کب؟ اور اس کا انداز کیا تھا؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟
- اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ان سوالات کا نہایت مدلل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا جو مفکرِ قرآن جناب پرویز کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوائے ماموریت اور ختمِ نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف۔ سفید کاغذ۔ جلد مضبوط مزین اور مطلا ۔۔۔ قیمت -/۷۵ روپے ۔۔۔ ڈاک پیکنگ -/۷ روپے

ملنے کے پتے (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

باب المراسلات

قانونِ شہادت

سوال: آج کل اس سوال نے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔ بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ آپ بتائیے کہ قرآن مجید کی رُو سے اس کی پوزیشن کیا ہے ؟

جواب :- طلوع اسلام اور پرویز صاحب کی تصانیف میں اس موضوع پر اتنی کثرت سے اور اتنی بار لکھا جا چکا ہے کہ اس کی مزید وضاحت اور اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن (حالیہ ہنگاموں کی وجہ سے) یہ سوال متعدد گوشوں کی طرف سے پوچھا گیا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ جو کچھ ہم لکھ چکے ہیں بکثرت احباب ایسے ہیں جن کی نظروں سے وہ نہیں گذرا یا وہ اسے بھول گئے ہیں۔ بنا بریں ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ جو کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے اسے ملخصاً دہرا دیا جائے۔

سب سے پہلے اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی یہ نہیں کہا گیا کہ جو معاملہ عدالت میں پیش ہو اس کے لئے عدالت دو مردوں کو بطور گواہ طلب کرے، اور اگر دو مرد گواہ نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو طلب کرے۔ اور ان تینوں کی شہادت قلمبند کرے۔ ایسا کہیں نہیں کہا گیا۔ نہ ہی یہ کہا گیا ہے کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ کسی مقام پر بھی شہادت کے ضمن میں عورتوں اور مردوں میں تخصیص یا تفریق نہیں کی گئی۔ قرآن نے صرف گواہ (شاہد) کہا ہے خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔ اس کی رو سے شہادت کے لئے تذکیر و تانیث (SEX) کی کوئی تخصیص ہے نہ شرط۔ ایک مقام البتہ ایسا ہے جہاں "ایک مرد اور دو عورتوں" کا ذکر ہے۔ اسے سمجھ لینے سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔

سورہ البقرہ کی آیت ۲۸۲ ($\frac{2}{282}$) میں — جو قرآن کریم کی (غالباً سب سے لمبی آیت ہے) تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قرض کے لین دین کے معاملہ میں کیا کرنا چاہئے اور کیسے ؟ اس میں سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ان معاملات کو ضبطِ تحریر میں لے آنا چاہئے اور دستاویز پر دو مرد گواہوں کی گواہی دلوا لینی چاہئے۔ اس کے بعد ہے: فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ ۔ "اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو فریقین کی رضامندی سے ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی دلوا لو"۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ دو عورتوں کی گواہی کے لئے کیوں کہا گیا ہے۔ فرمایا۔ یہ اس لئے کہ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ط ($\frac{2}{282}$)۔ اس کے عام معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ "اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے"۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے "أَن تَضِلَّ" کہا ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں۔ مختلف چیزوں کا اس طرح

خلط ملط ہو جاتا کہ انہیں آسانی سے الگ الگ نہ کیا جا سکے۔ اسے انگریزی زبان میں (TOGET CONFUSED) کہا جائے گا۔ مولانا محمود الحسنؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے (مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ (۵۳/۲) میں) اس کا ترجمہ "بہک جانا" کیا ہے۔ جو کچھ قرآن نے کہا ہے اس کا مفہوم و مقصود یہ ہے کہ اگر کل کو اس دستاویز کے ضمن میں کوئی تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ اور معاملہ عدالت میں پیش ہوا تو

(۱) عدالت اس مرد گواہ اور ان دو عورتوں میں سے ایک کی شہادت قلم بند کرے گی۔

(۲) اگر اس عورت کو کہیں مغالطہ لگ جائے۔ کسی شق میں التباس ہو جائے، تو دوسری عورت اُسے یاد دلا دے (فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا) کہ صحیح صورت حال کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسری عورت عدالت سے کچھ نہیں کہے گی۔ (قرآن کے الفاظ میں) اُس گواہی دینے والی اپنی بہن کو یاد دلا دے گی کہ صحیح بات کیا تھی۔ اس سے وہ گواہ عورت اپنے مغالطہ کو رفع کر لے گی۔

(۳) اگر گواہی دینے والی عورت کو کوئی مغالطہ نہ لگے تو یہ دوسری عورت مداخلت ہی نہیں کرے گی۔

(۴) اسے مداخلت کرنے کی ضرورت پیش آئے یا نہ، قرآن نے یہ نہیں کہا کہ پہلی عورت کی گواہی کے بعد، اس دوسری عورت کی بھی گواہی لی جائے گی۔ گواہی اس ایک عورت ہی کی کافی سمجھی جائے گی۔

سوچئے کہ اس سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ضروری ہوگی۔ اور پھر یہ مطلب کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہوتی ہے؟ قرآن سے ان میں سے کوئی بات بھی ثابت نہیں۔

سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ احتیاط عورتوں کے ضمن میں کیوں ضروری قرار دی۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے اُس زمانہ کے حالات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن میں یہ احتیاط ضروری سمجھی گئی تھی۔ اس زمانہ میں (عرب میں) ایسے مردوں کی تعداد ہی بہت کم تھی جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، چہ جائیکہ عورتیں۔ وہ بالعموم ان پڑھ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس معاشرہ میں عورت کو جس حالت میں رکھا گیا تھا، اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے أَوَمَن يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝ (۴۳/۱۸) "اس زیورات میں پلی ہوئی کی کیفیت یہ تھی کہ جھگڑے کے وقت خود اپنے موقف کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی تھی"۔ یہ تھی عورتوں کی حالت اس زمانے میں وہ تو زمانۂ نزولِ قرآن کی بات ہے۔ آپ آج (بیسویں صدی میں) ہمارے ہاں کی مستورات میں سے کسی کو پہلے پہل عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیجئے جہاں گرد و پیش اجنبی مردوں کا ہجوم ہو۔ وہاں دیکھئے کہ اس بے چاری کی حالت کیا ہوتی ہے (بالخصوص وکلا کی تنقیحات اور فریقِ مخالف کی تفریحات کے سامنے!) اس کے پسینے چھوٹ جائیں گے اور اوسان خطا ہو جائیں گے۔ اگر اس کے ساتھ اس کی جان پہچان والی کوئی عورت موجود ہو تو اس کا حوصلہ بندھ جائے گا، بالخصوص ایسی عورت جسے اجازت ہو کہ اگر اُسے کہیں کچھ التباس ہو جائے تو وہ اس کی مدد کرے۔

یہ تھی وہ ضرورت جس کے پیشِ نظر قرآن نے اس احتیاط کو ضروری سمجھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کے نزدیک عورت، ناقص العقل اور ناقابلِ اعتماد ہے اور مردوں کے مقابلہ میں ادھی شخصیت کی مالک۔ اس احتیاط سے مقصد کیا تھا اسے قرآن نے خود ہی ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ ذٰلِكُمْ

اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّھَادَۃِ وَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَرْتَابُوْۤا۔ (۲/۲۸۲)۔ یہ چیز قانونِ عدل کے تقاضے کو پورا کرنے کے زیادہ قریب ہے۔ اس سے شہادت محکم ہو جاتی ہے اور شکوک و شبہات کا بہت کم امکان رہتا ہے۔ یعنی یہ احتیاط شہادت کو موثق بنانے کے لئے تھی، جس طرح شہادت کو موثق اور محکم بنانے کے لئے ایک گواہ کے بجائے دو دو اور چار چار گواہ ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ جو قانونِ شہادت ہمارے ہاں اس وقت رائج ہے اس کی رو سے اگر گواہ "تجدیدِ یادداشت" کے لئے کوئی ریکارڈ طلب کرے تو اسے مہیا کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں "تجدیدِ یادداشت" کا فریضہ حسب الضرورت گواہ عورت کی یہ ہم نفس ادا کرتی تھی۔

اگر قرآن کی رو سے ایسا کوئی قانون بنانا ہو تو اس کی شکل کچھ اس طرح ہوگی:۔

لین دین کے معاملات کو منضبطِ تحریر میں لے آنا چاہئے اور جو دستاویز مرتب کی جائے اس پر دو مردوں کی گواہی دلوا لینی چاہئے۔ اگر کہیں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ دو مرد موجود نہ ہوں[1] تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی دلوا لینی چاہئے۔ عدالت میں اس مرد اور ان دو عورتوں میں سے کسی ایک کی شہادت کافی ہوگی، اس رعایت کے ساتھ کہ اگر اسے کوئی اشتباہ ہو جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے کہ صحیح بات یوں تھی (اس کی حیثیت گویا تنازعہ کی تنازعہ میں سامع کی ہوگی)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ کوئی ایسا قانون جس کی رو سے دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر تصور کی جائے۔ قرآن کریم کے خلاف ہوگا۔

لیکن ہمارے یہاں تو بات اس سے بھی آگے جا چکی ہے۔ اس وقت حدود (سرقہ۔ زنا۔ قذف وغیرہ) کے متعلق جو آرڈیننس نافذ ہے اس کی رو سے گواہوں کے مرد ہونے کی شرط ہے۔ عورتوں کی گواہی قابلِ قبول ہی نہیں۔ —— خواہ وہ دو ہوں۔ اور خواہ سو ہوں۔ عورت کسی مقدمہ میں گواہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی یکسر قرآن کے خلاف ہے۔

ان اقدامات سے ہمیں ایک خوشی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جب ہم کہتے تھے کہ ہماری فقہ اور روایات میں اس اس قسم کے قوانین ہیں تو کوئی باور نہیں کرتا تھا۔ اب جو یہ قوانین مرتب ہو کر نافذ بھی ہو رہے ہیں تو لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام ٹھیک ہی کہتا تھا۔

لیکن اس سے اسلام، دنیا میں جس قدر بدنام ہو رہا ہے اس سے ہم خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ حدود و تعزیرات میں عورت سرے سے گواہ ہو ہی نہیں سکتی۔ جن تنازعات میں اس کی گواہی لائقِ قبول ہوگی ان میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر متصور ہوگی۔ عورت آدھے ورثے کی حقدار ہوگی۔ قتل کے وقوعہ میں مقتولہ عورت کی دیت (خوں بہا) مرد کی دیت سے نصف ہوگی۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ اس قسم کے قوانین بنائے جاتے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں، دنیا میں کہیں نہیں مل سکتے! یہ قوانین ہمارے دورِ ملوکیت میں اس زمانے میں وضع ہوئے تھے جب عورتیں مویشیوں کی منڈی (نخاس) میں نیلام ہوا کرتی تھیں! اور تماشا یہ کہ اگر کوئی ان قوانین کے خلاف لب کشائی کرے تو دہائی مچا دی جاتی ہے کہ یہ خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف بغاوت ہے!

---

[1] آج کل ایسی صورت شاید ہی کہیں پیدا ہو!

سلسلہ مطالب الفرقان

(قرآن کریم کی بصیرت افروز تفسیر)

پرویز صاحب کی زندگی کا مشن، قرآن کریم کا سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے

لغات القرآن مرتب کی جس میں مستند کتب لغت اور قرآنی آیات کی روشنی میں متعین کیا گیا کہ زمانہ نزول قرآن میں ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جاتا تھا۔ اسی تحقیق کے دوران یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا صرف مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے

مفہوم القرآن مرتب کیا جو سارے قرآن کا نہایت حقیقت کشا مفہوم سامنے لے آتا ہے۔ پھر ان دونوں کی روشنی میں انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر کا سلسلہ شروع کیا جو اس اصول پہ مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اس سلسلہ کی پانچ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔

مطالب الفرقان جلد اول مشتمل بر سورۂ فاتحہ و سورۂ بقرہ آیات ۱ تا ۲۹

مطالب الفرقان جلد دوم۔ سورۂ بقرہ آیات ۳۰ تا ۱۱۲

مطالب الفرقان جلد سوم۔ سورۂ بقرہ آیات ۱۱۳ تا ۲۸۶ (اختتام)

مطالب الفرقان جلد چہارم۔ سورۂ آل عمران۔ النساء۔ اور مائدہ

مطالب الفرقان جلد پنجم۔ سورۂ الانعام (مکمل) و سورۂ اعراف آیات ۱ تا ۱۵۸

ان پانچوں جلدوں کے مضامین کے انڈکس بھی شائع کئے گئے ہیں۔

تمام جلدیں اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر چھپی ہیں اور مضبوط دیدہ زیب جلدوں میں محفوظ ہیں۔ اس وقت ان کی قیمتیں (علاوہ محصول ڈاک) یہ ہیں: جلد اول ۶۰/- روپے۔ دوم ۷۵/-۔ سوم ۷۵/-، چہارم ۹۰/-، پنجم ۷۵/-

مکمل پانچ جلدیں ۳۷۵/- روپے

ملنے کا پتہ:-

(۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

اسلام —— دورِ ملوکیت میں

(لہو و لعب کی زندگی)

طلوعِ اسلام بابت نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں عنوان بالا پر ایک مبسوط مقالہ آپ کی نظروں سے گزرا ہے۔ اس میں عہدِ عباسیہ کی ملوکیت کے صرف ایک گوشہ کی جھلک دکھائی گئی تھی۔ یعنی غلام اور لونڈیوں سے متعلق گوشے کی۔ اسے اس قدر پسند کیا گیا کہ ہمیں تقاضے موصول ہوئے کہ اس قسم کے دیگر گوشوں پر سے بھی پردہ اٹھایا جائے۔ زیرِ نظر مقالہ میں آپ دیکھیں گے کہ اُس دور میں معاشرہ کس طرح لہو و لعب میں ڈوب گیا تھا۔

"تاریخ کے اس باب میں ایک نکتہ خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے اپنی تصنیف۔ شاہکار رسالتؐ۔ میں بتایا ہے، صدرِ اوّل کے قرآنی اسلام کو مجمی مذہب میں تبدیل کرنے میں (اُس زمانے کے) ایرانیوں کا جذبۂ انتقام کارفرما تھا۔ انہوں نے عربوں کے ہاتھوں نہایت ذلت آمیز شکست کھائی تو اس کا بدلہ لینے کی تدبیر سوچ لی۔ انہوں نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ عربوں کی قوت کا راز قرآن کی تعلیم میں مضمر ہے، لہٰذا ان سے بدلہ لینے کا ایک ہی طریق ہے کہ ان سے قرآن کو چھڑا دیا جائے۔ اس کے بعد اسلام پر جو کچھ بیتی ہے وہ ان کی اسی سازش کا نتیجہ ہے۔

بنی امیہ کا دور ان ایرانیوں کے اثرات سے محفوظ رہا اس لئے اس معاشرہ پر عربیت غالب رہی۔ بنی عباس نے سلطنت ان کے توسط سے حاصل کی تھی اس لئے وہ پوری مملکت پر چھا گئے۔ اس دور کی تاریخ اس حقیقت کی داستان ہے کہ ان کے اثرات کس طرح بتدریج عباسی معاشرہ میں سرایت کرتے گئے۔ یہی تدریج ہمیں سلاطین عباسیہ کے کردار میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ بھی بتدریج عربیت سے ایرانیت کی طرف سرکتے گئے اور ان کے ساتھ ہی اسلامی اقدار بھی عجمیت میں تبدیل ہوتی گئیں۔ زیرِ نظر مقالہ اسی تدریج اور تحول کا آئینہ دار ہے۔

ان سلاطین کے کردار سے ہمیں زیادہ بوالعجبی اُس دور کے علماء کے کردار میں نظر آتی ہے۔ یہ حضرات، یزید ابن معاویہؓ کو سنگین ترین جرم کا مرتکب قرار دیتے تھے کہ اس نے ملوکیت کی بنا ڈال کر اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان سلاطین کے حق میں دعائیں مانگتے اور ان کی شان میں مدح و ستائش کے قصیدے پڑھتے تھے جنہوں نے، یزید ہی کی طرح سلطنت حاصل کی تھی۔ ان کی یہ دوغلی روش آج تک جاری ہے۔ انہی کے ہاتھوں فقہ کے وہ قوانین مرتب ہوئے جن سے شخصی حکومت اور نظامِ جاگیرداری اور سرمایہ داری عین مطابق اسلام قرار پا گئے۔ اُسی دور کا وضع شدہ اسلام، آج تک حقیقی اسلام کے نام سے رائج چلا آ رہا ہے۔

اس تمہیدی تعارف کے بعد، مقالہ کی طرف آیئے حسبِ سابق عربی اشعار کے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔

تمہید

کیا لوگ اس عہد میں تعیش و تنعم اور لہو و لعب کی زندگی بسر کرتے تھے . یا پاک دامنی اور حقیقت پسندی کی زندگی گذارتے تھے ؟ ابتدائی خلفائے عباسیہ دینی امور کا لحاظ رکھتے اور ان کی پابندی کرتے اور صرف انہی چیزوں تک محدود رہتے تھے جنہیں خدا نے ان کے لئے حلال قرار دیا تھا ؟ ـــ جیسا کہ بعض مورخین نے ان کی تصویر کھینچی ہے ـــ یا بہت سی قیود کو توڑ کر لہو و لعب میں اسراف کی حد تک پہنچ گئے تھے ؟ ـــ جیسا کہ دوسرے لوگوں نے ان کی تصویر کھینچی ہے ـــ معاشرہ کی حالت ان کے زمانہ میں وسعت ، فراخی اور فارغ البالی کی تھی یا تنگی اور فقر و فاقہ کی ؟ ان تمام باتوں کے اثرات علم و فن اور ادب پر کیا مرتب ہوئے ؟

اس فصل میں ہم ان باتوں کا جواب دینا چاہتے ہیں ۔

اُمویوں اور عباسیوں کے درمیان مقابلہ

جب ہم عمومی انداز سے حیاتِ امویہ اور حیاتِ عباسیہ کے درمیان موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اموی طرزِ حیات زیادہ سے زیادہ سادہ اور تکلفات سے زیادہ دُور رہتا تھا ۔ جو بدوی ، سادہ ، عربی ذوق کی نشان دہی کرتا تھا ۔ عربی عنصر چونکہ اموی عہد میں غالب تھا اس لئے اس نے اپنے عہد کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسی رنگ میں رنگ رکھا تھا ۔ وہ ترفہ اور تنعم کی چیزیں اختیار کرنا چاہتے بھی تھے تو دوسری قوموں کے ترفہ و تنعم کی چیزوں میں انتخاب کر کے وہ اختیار کرتے تھے ۔ انہیں بالکلیہ اور جوں کا توں اختیار نہیں کرتے تھے ۔ پھر اس کے بعد وہ اپنے عربی ذوق اور میلان کے مطابق اس میں ایک طرح کا اعتدال پیدا کر لیا کرتے تھے اور اسے ایک ایسی چیز بنا دیتے تھے کہ نہ تو وہ عربی ہوتی تھی اور نہ خالص ایرانی اور نہ ہی خالص رومی ۔ انہوں نے ایرانی دعوتوں کو دیکھا ۔ اور خلفاء اور امراء نے ان دعوتوں کے مطابق اپنی دعوتوں کو بھی ایک طرح سے خوش نما بنانے کی کوششیں کیں لیکن جب ایک عربی بادیہ نشین امیر معاویہؓ یا عبد الملک کے دربار میں جاتا تو وہ یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی نئی فضا میں آ گیا ہے جو اس کی مانوس فضا اور ماحول سے کوئی تعلق نہ رکھتی ہو ۔

ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ اپنے کسی لڑکے کی ختنہ میں حجاج بن یوسف نے دعوتِ ولیمہ کا انتظام کرنا چاہا ۔ اس نے کسی ایرانی سردار کو بلایا اور ایرانیوں کی دعوتوں کے متعلق اس سے پوچھا ۔ حجاج نے اس سے کہا کہ مجھے کسی سب سے بڑی دعوت کا حال بتاؤ ۔ ایرانی سردار نے عرض کیا کہ اے امیر ! مجھے کسریٰ کے ایک مرزبان کی دعوت میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا جس نے ایرانیوں کے لئے اس دعوت کا انتظام کیا تھا ۔ اس مرزبان نے چاندی کے خوانوں[1] پر سونے کے بڑے بڑے برتنوں میں کھانا پیش کرنے کا انتظام کیا تھا ۔ ہر خوان پر چار آدمیوں کا کھانا تھا ۔ اور اسے چار باندیاں اُٹھائے ہوئے تھیں ۔ ہر خوان پر چار چار آدمی بیٹھ گئے ۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو ان چاروں آدمیوں کے پیچھے پیچھے وہ خوان مع اس کے برتن اور اس کی باندیاں بھیج دی گئیں اور انہی کو عطا کر دی گئیں ۔ حجاج نے یہ سن کر کہا ۔ غلام ! تم اونٹوں کو ذبح کرو اور لوگوں کو کھانا کھلاؤ ۔ گویا حجاج نے اس دعوت کے تکلفات کو ناپسند کیا اور بے جا اسراف تصور کیا ۔ یہ چیز اس کے عربی ذوق کے خلاف تھی ۔ اس نے اسے جھوٹی نمائش اور ایک ایسا اظہارِ شان شمار کیا جو اس کے

---

[1] خوان ۔ اس چوکی کو کہتے تھے جس پر کھانا چُن کر رکھا جاتا تھا جیسا کہ آج کل میزیں ہوتی ہیں اس زمانہ میں اس مقصد کے لئے بڑی بڑی چوکیاں ہی ہوا کرتی تھیں ۔ [2] ابن خلدون ، مقدمہ ۱۴۵ ج ۱

لئے مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے اسے اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کی عادت پر ہی اکتفا کیا۔ ان کا یہی حال دفاتر اور دیگر تہذیبی انواع و اقسام میں بھی تھا مختصر یہ ہے کہ اموی عہدِ حکومت میں عربی ذوق پوری طرح پر نمایاں تھا۔ اور دمشق، مکہ، مدینہ اور دیگر شہروں کا تعلق —— یعنی اجتماعی جہت سے، سیاسی جہت سے نہیں —— ایک مضبوط اور مستحکم تعلق تھا۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے اور ایک دوسرے کے ذوق سے اچھی طرح لطف اندوز ہوتے تھے۔ اسلام کو بھی ان کے زمانہ میں اپنی سادگی اور پابندیوں کے ساتھ عباسی عہد کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھا گیا تھا۔

عباسیوں کا یہ حال نہیں تھا۔ اگر اموی خلفاء و امراء دوسری تہذیبوں کی کچھ عادتوں اور باتوں کو اپنے ہاں اپنے رنگ میں رنگ کر منتقل کرتے تھے تو عباسی خلفاء اور امراء ان کے برعکس بالکلیہ طور پر خود ان قوموں کی عادتوں اور رنگی پابندیوں کی طرف منتقل ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ذرا "نوروز" کو لے لیجئے۔ "نوروز" پرانے زمانہ سے پارسیوں کی عید چلی آتی تھی۔ ہم نے اموی عہدِ حکومت میں کوئی ایسی بات نہیں سُنی جس سے یہ پتہ لگ سکے کہ انہوں نے اسے کوئی اہمیت دی ہو۔ لیکن عباسیوں نے اسے ایک قومی عید بنا لیا تھا۔ وہ اس میں اسی طرح جمع ہوتے تھے جیسے عید الفطر میں جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو تحفے دیتے۔ شعراء قصیدے پڑھتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ خلفاء خاص اہتمام سے دربار منعقد کرتے اور لوگ انہیں مبارکبادیں پیش کرتے تھے۔ یہی حال لباس وغیرہ کا تھا۔ چنانچہ ٹوپی، عبا، اور طرح طرح کے ایرانی ملبوس چل چکے تھے۔ قاضی لوگ بڑی بڑی ٹوپیاں پہنتے اور خلفاء ٹوپیوں کے اوپر عمامے باندھتے تھے۔ عماموں میں بھی طرح طرح کے تفنن اختیار کئے جاتے تھے۔ چنانچہ مختلف طبقات کے مختلف عمامے ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ ایرانیوں میں دستور تھا۔ خلفاء کا عمامہ اور طرح کا ہوتا تھا۔ فقہا کا دوسری طرح کا۔ خچر ہانکنے والوں کا تیسری طرح کا، اعرابیوں کا عمامہ چوتھی طرز کا۔ غرضکہ ہر جماعت کا لباس الگ ہوا کرتا تھا۔ قاضیوں کا لباس الگ ہوتا تھا۔ قاضیوں کے دفتر سے متعلق افراد کا لباس الگ ہوتا تھا۔ سپاہیوں کا لباس الگ ہوتا تھا۔ اور سلطان کے درباریوں کا اپنے اپنے رتبہ کے لحاظ سے الگ الگ لباس ہوتا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگ مبطنہ پہنتے تھے۔ کچھ دُرّاعہ پہنتے تھے اور کچھ "بازبند" پہنتے تھے۔ شعراء زرکار کشادہ دار اور سیاہ چادریں اوڑھتے تھے —— ایک شاعر اس زمانہ میں پرانا لباس پہنا کرتا تھا تو کچھ شعراء نے اس کی ہجو میں اشعار کہہ ڈالے[1]

اموی خلفاء جب کسی کو عطیہ دیتے تھے تو عربوں کے مسلک اور ان کی بدویانہ طرزِ زندگی کے مطابق ان کے عطایا زیادہ تر اونٹوں کی شکل میں ہوا کرتے تھے لیکن بنو عباس کی حکومت میں ان کے انعامات درہم و دینار کی تھیلیاں، کپڑوں کے تخت اور زین اور سازو سامان سمیت گھوڑے وغیرہ ہوا کرتے تھے[2]۔ خلاصہ یہ کہ عباسی عہدِ حکومت میں لوگ —— بنو امیہ کے دورِ حکومت کے برعکس —— دوسری قوموں کی عادات و رسوم کی طرف منتقل ہو چکے تھے اور اس میں بہت زیادہ انہماک سے کام لینے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کے مسلمانوں اور جزیرۂ عرب کے مسلمانوں کے درمیان اجتماعی رشتے اور شکل و صورت کی ہم آہنگی تقریباً ختم ہو چکی تھی یا ختم ہونے لگی تھی۔ اغانی نے ناصح بن ثومہ کے متعلق ایک عجیب واقعہ

---

[1] لباس اور انواع کی بحث البیان والتبیین صفحہ ۵، جلد ۳ اور اس کے بعد کے صفحات پر دیکھئے۔ [2] ابن خلدون صفحہ ۱۴ جلد ۱۔

نقل کیا ہے — ناعص بن ثومہ — ایک بدوی اکھڑ شاعر ہے — اسے حلب میں ایک شادی کی محفل میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ جو کچھ اس نے وہاں دیکھا اسے دیکھ کر اس کی عقل چکرانے لگی اور نگہ پراگندہ ہوگئی کیونکہ بادیہ نشینی کی زندگی میں اس نے یہ چیزیں خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ اسے دلہن کی آرائش سے انتہائی حیرت ہوئی۔ طرح طرح کے لباسوں اور طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزوں اور موسیقی کے ایرانی آلات وغیرہ سے دو دنگ ہو کر رہ گیا۔ جوں جوں اس کا تحیر بڑھتا جا رہا تھا لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے[1]۔ اگر کہیں بدقسمتی سے وہ بغداد میں کسی شادی کی محفل میں شریک ہو گیا ہوتا تو شاید وہ سچ مچ پاگل ہی ہو گیا ہوتا۔

لہو و لعب کا تدریجی ارتقاء

اس زمانہ میں کچھ لوگ لذائذ و نعم میں حدود سے متجاوز ہو گئے اور قصداً افراط سے کام لینے لگے۔ اور لطف اندوزیوں کے نئے انداز اور طریقے ایجاد کرنے لگے تھے جب لطف اندوزی کے کسی ایک انداز سے اُکتا جاتے تو ایک نیا انداز اختراع کر لیتے۔ جب ذرا اس طوفان میں سکون کے آثار نظر آنے لگتے تو اس کے داعی انہیں اُبھارنے لگتے کہ تنعم و تعیش میں ڈوب جانا چاہئے۔

اگر ہم دولتِ عباسیہ کی تاریخ کا اس ضمن میں تتبع کریں تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ یہ حکومت تدریجی قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ اس انتہا تک پہنچی تھی۔ اور ہر خلیفہ — عموماً — اپنے پہلے خلیفہ سے ترفہ و تنعم کی سیڑھی پر ایک دو درجے بلند ہوتا جاتا تھا۔ اگر ہم اس ترقی کے بیان کے لئے رسمی خط کھینچنا شروع کر دیں تو ہم شاید اس بلندی کی مقدار کو متعین کر سکیں جو یکساں طور پر مسلسل ہر خلیفہ تنعم کی طرف چڑھنے میں برابر طے کرتا جا رہا تھا۔ اور عوام الناس تو ہر زمانہ میں — اور خصوصیت کے ساتھ ان زمانوں میں — اپنے امیر کے تابع ہوتے ہیں۔

دولتِ عباسیہ کی ابتداء ہوئی تو بنو امیہ اور ان کے منتسبین کرم میں سے بے شمار دشمن ان کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ جب خلافت کے لئے سفاح کو اور اس کے بعد منصور کو منتخب کیا گیا تو خود عباسی گھرانے کے بہت سے لوگ ناراض ہو گئے۔ اُدھر شیعان علی بھی بگڑ گئے۔ لہٰذا قیامِ حکومت کے لئے ایسے خلفاء کی ضرورت تھی جو لہو و لعب سے دُور رہتے ہوئے حقائق و واقعات کا مقابلہ کر سکیں اور اپنا پورا وقت حکومت کی تاسیس پر صرف کر سکیں۔ ساتھ ہی اپنے ہم خیال اور ہم نوا پیدا کر لیں۔ دشمنوں کا قلع قمع کرنے اور باغیوں کا خون بہانے پر پوری توجہ دے سکیں۔ حتیٰ کہ یہ دور ختم ہو گیا۔ معاملات پُرسکون ہو گئے۔ باغیوں کا سر کچل دیا گیا اور دوسرے لوگ مطیع و فرمانبردار بن گئے۔ اور سلطنت میں امن و امان قائم ہو گیا تو اب آنے والے خلفاء کے لئے امن و امان اور سکون و اطمینان کی وجہ سے فراغت کا اتنا وقت مل سکتا تھا جو ترفہ و تنعم اور لہو و لعب میں گزارا جا سکے۔ لیکن وہ سارا وقت ان امور کے لئے نہیں دے سکتے تھے کیونکہ ان کو اندرونی معاملات کی تنظیم پر بھی توجہ دینی پڑتی تھی جبکہ اس سے پہلے خلفاء کا سارا زور بس خارجی امور کی تنظیم بنا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ جب آگے چل کر داخلی اور خارجی معاملات یکساں طور پر استوار ہو گئے اور معاملات اپنے محور پر گردش کرنے اور ان بنیادوں پر یکسانیت کے ساتھ چلنے لگے جنہیں ابتدائی خلفاء نے مضبوطی کے ساتھ استوار کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی خلفاء نے دیکھا کہ مال و دولت کے وہ ذخیرے فراوانی کے ساتھ ان سرچشموں سے مسلسل بہتے

---

[1] یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اغانی صفحہ ۹۰ – ۳ جلد ۱۲ میں ملاحظہ فرمائیے۔

چلے آ رہے تھے جو ابتدائی خلفاء بیرونی خطرات کی حفاظت اور اندرونی تنظیم کر کے قائم کر دیئے تھے تو اب انہوں نے عیش و عشرت کی داد دینی شروع کی اور خوب خوب داد دی اور اب ان کے پاس اس کے لئے وقت میں بھی کافی گنجائش تھی۔

عباسی خلفاء مکمل طور پر ان ادوار کا نمونہ پیش کرتے تھے۔ ان کی تاریخ ہمارے اس قول کی شاہد ہے چنانچہ ابوالعباس

سفّاح سفاح — ان کا پہلا خلیفہ — حقیقت شناسی اور علم کو لہو و لعب کی انواع پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ مجھے اس آدمی پر تعجب آتا ہے جو علمی ترقیات کو چھوڑ جہالت میں بڑھتا جاتا ہے اور اسے پسند کرتا ہے۔ ابوبکر ہذلی نے ایک مرتبہ پوچھ لیا کہ اے امیرالمومنین! آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟ سفاح نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ وہ تم جیسے اور تمہارے اصحاب جیسے لوگوں کے ساتھ تو بیٹھتا نہیں۔ اپنی بیوی یا باندی کے پاس اندر چلا جاتا ہے اور بیہودہ باتیں سننے اور خرافات بکنے میں اپنا وقت گذار دیتا ہے۔ جب سفاح نے ام سلمہ سے شادی کر لی تو اس نے قسم کھائی تھی کہ نہ اس کے بعد کوئی دوسری شادی کرے گا اور نہ ہی استمتاع کے لئے کوئی باندی رکھے گا۔ کچھ مقربانِ دربار نے اس کی خلافت کے زمانہ میں وسوسہ اندازی کرنی چاہی اور باندیوں اور ان کے انواع و اقسام کا تذکرہ کر کے لذت اور شہوت کے جذبات کو بھڑکانا چاہا۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے[1] سفاح کی زندگی محض خوں ریزی کی زندگی رہی[2] اور دشمنوں کی سرکوبی اس کا مشغلہ رہا۔

منصور سفاح کا جانشین منصور ہوا جو دولتِ عباسیہ کی نمایاں شخصیت اور اس کی بنیادوں کو استوار کرنے والی ہستی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے خود اپنے گھرانے اور غیروں میں سے اپنے اور حکومت کے دشمنوں کا صفایا کیا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اسے تو لہو و لعب کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ طبری نے یحییٰ بن سلیم سے نقل کیا ہے کہ منصور کے گھر میں کبھی لہو و لعب یا لہو و لعب سے مشابہ اور بے کار کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔ سوائے ایک دن کے کہ ہم نے منصور کے بیٹے عبدالعزیز کو دیکھا (اس کا انتقال نو عمری ہی میں ہو گیا تھا) کہ وہ باہر نکلا، کمان گلے میں ڈالے ہوئے، عمامہ باندھے ہوئے، چادر اوڑھے ہوئے۔ بالکل ایک اعرابی لڑکے کی ہیئت بنائے ہوئے۔ گھوڑے پر دو خرجینوں کے درمیان نشست پر بیٹھا ہوا۔ ان دونوں خرجینوں میں مقل، جوتے، مسواکیں اور وہ چیزیں تھیں جو اعرابی لوگ کسی کو تحفہ میں دے سکتے ہیں۔ لوگوں کو اس ہیئت کذائی پر بڑا تعجب ہوا اور اُسے بالکل ایک نئی سی بات خیال کیا۔ وہ لڑکا پل پر سے گزر کر رُصافہ میں مہدی کے پاس گیا اور اسے تحفہ میں وہ تمام چیزیں پیش کیں۔ خرجینوں میں جو کچھ تھا مہدی نے اسے قبول کر کے دونوں خرجینوں کو درہموں سے پُر کر دیا۔ لڑکا واپس لوٹ آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بادشاہوں کا ایک کھیل تھا[3]۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگوں نے لڑکے کے اس عمل کو باوجود اس کی سادگی اور لطافت کے ایک نئی سی بات محسوس کیا۔ — ایک مرتبہ منصور نے اپنے مکان میں شور سُنا۔ اس نے شور کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ ایک خدمت گار باندیوں کے درمیان بیٹھا ہوا طنبورہ بجا رہا ہے۔ اور باندیاں ہنس رہی ہیں۔ منصور اُٹھ کر اس جگہ گیا جہاں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ غلام اور باندیوں نے جوں ہی منصور کو دیکھا سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ منصور نے حکم دیا کہ طنبورہ کو اس خدمت گار کے سر پر مار مار کر توڑ دیا جائے۔ اور اس کے بعد اس خدمت گار کو فروخت کرا دیا[4]۔ منصور نہایت کفایت شعار آدمی تھا۔ لہو و لعب سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے یہ شعور تھا کہ لوگ اعمال میں اس کی پیروی کرتے ہیں لہٰذا وہ اس کے لئے

---

[1] ماخوذ از مسعودی صفحہ ۱۷۰ جلد ۲ و مابعد [2] مسعودی صفحہ ۲۰۰ جلد ۲ [3] طبری صفحہ ۲۹۳ جلد ۹ [4] طبری صفحہ ۲۹۴ جلد ۹

ہر وقت کمربستہ رہتا تھا۔ جب طریف بن تمیم عنبری نے اس کے یہ شعر پڑھے

میرا نیزہ درخت نبع کی لکڑی کا بنا ہوا ہے جسے مضبوط آدمیوں کا دبانا اور تیل لگانا اور آگ دکھانا غرضکہ کوئی بات ٹیڑھا نہیں کر سکتی۔ میں جب کسی خوف زدہ کو پناہ دیتا ہوں تو تمام راستے اس کے لئے مامون ہو جاتے ہیں اور جب میں کسی مامون آدمی کو خوف زدہ کر دیتا ہوں تو اس کا گھر بھی اس کے لئے باعث اضطراب بن جاتا ہے۔ معاملات کو جب میں کسی گھاٹ پہ اتارتا ہوں تو وہ خود ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ معاملات کا تو کام ہی آنا اور واپس لوٹ جانا ہے۔

منصور نے کہا کہ طریف کے ان دونوں شعروں کا میں زیادہ حق دار ہوں اس نے اپنی تعریف نہیں کی بلکہ میری ہی تعریف کی ہے۔ منصور میں آخر دم تک بدویانہ خو بو اور سادگی کی طرف میلان رہا۔

اسے اطلاع ملی کہ عبداللہ ابن مصعب ابن الزبیر صبح تک ایک باندی کے پاس رہے جو انہیں ان کے اشعار گا گا کر سناتی رہی۔ ان اشعار میں عشقیہ مضامین اور رندانہ مطالب بیان کئے گئے تھے۔ اس پر منصور نے کہا کہ مجھے تو یہ بات پسند آتی ہے کہ کوئی حُدی خواں آج کی رات مجھے طریف عنبری کے اشعار حُدی کی طرز پر سنائے۔ میرے نزدیک یہ باتیں زیادہ مانوس اور اہل عقل کی پسندیدگی کے زیادہ قابل ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک حُدی خواں کو بلایا تاکہ وہ اسے حدی سنائے۔ منصور نے اسے خود ایسے اشعار بتائے جن کا تعلق مکارم اخلاق پر فخر کرنے سے تھا۔ چنانچہ حُدی خواں نے وہ اشعار حُدی کی طرز پر اسے گا کر سنائے۔ منصور نے کہا کہ بخدا یہ چیزیں انسانی مروت کو زیادہ پیدا کرنے والی اور شریف آدمیوں کے زیادہ لائق ہیں۔ پھر ربیع کو بلا کر حکم دیا کہ اس حُدی خواں کو ایک درہم دے دو۔ حُدی خواں نے عرض کیا۔ اے امیرالمومنین! میں نے ہشام بن عبدالملک کو حدی سنائی تھی تو اس نے مجھے بیس ہزار درہم دیئے تھے۔ اور آپ ایک درہم ہی دے رہے ہیں؟ منصور نے کہا۔ انا للہ! تو نے اس بات کا ذکر کر دیا جس کا ذکر ہم پسند نہیں کرتے تھے۔ تو نے اس آدمی کا واقعہ بیان کیا ہے جس نے اکثر و بیشتر خدا کا مال بغیر اس کے کہ وہ اس کے لئے حلال ہو قبضایا اور اسے ناجائز موقعہ پہ صرف کیا ہے۔ اے ربیع! مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اس کو پکڑ لو اور اس سے وہ بیس ہزار درہم واپس لے لو جو اسے ہشام بن عبدالملک نے دیئے تھے۔ بے چارہ حدی خواں برابر روتا رہا اور فریاد کرتا رہا۔ بڑی مشکل سے منصور نے اسے چھوڑا۔[1]

اس طرح منصور شراب کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اور نہ اس کے دستر خوان پہ شراب پی جاتی تھی۔ بختیشوع طبیب جب آیا تو منصور نے اس کے لئے صبح کا کھانا منگایا۔ جب اس کے سامنے دستر خوان بچھایا گیا تو اس نے شراب مانگی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ امیرالمومنین کے دستر خوان پہ شراب تو نہیں پی جاتی۔ بختیشوع نے کہا کہ میں تو ایسا کوئی کھانا نہیں کھاتا جس کے ساتھ شراب نہ ہو۔ اس کی اطلاع منصور کو دی گئی تو منصور نے کہا اسے چھوڑ دو۔[2]

پھر وہ کسی حُدی خواں، شاعر اور مدح گوئی کرنے والے کو عطایا دینے میں بھی اسراف سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ اپنی اولاد کو اگر وہ اسراف کرتے تو تنبیہ کرتا رہتا تھا۔ گراں قیمت لباس نہیں پہنتا تھا۔ دستر خوان پہ بھی زیادہ صرفہ نہیں کرتا تھا غرضکہ زندگی کے تمام شعبوں میں میانہ روی اس کا شعار تھا حتیٰ کہ ان چیزوں میں بھی جو خدا نے اس کے لئے حلال کی تھیں وہ میانہ روی

۱؎ یہ پورا واقعہ اغانی صفحہ ۱۱۲ جلد ۱۳ پہ مذکور ہے۔

۲؎ طبری صفحہ ۳۰۹ جلد ۹۔

کو نہیں چھوڑتا تھا بلکہ بعض اوقات تو وہ میانہ روی میں اتنا غلو کرنے لگتا تھا جتنا اس کے جانشین اسراف میں غلو کرنے لگے تھے ___ لوگوں کا بیان ہے کہ منصور کی ماں ___ جو ایک مغربی عورت تھی ... کے شکم میں جب منصور کا حمل تھا تو اس کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شیر کو اٹھائے ہوئے ہے جیسے شیر سجدہ کر رہے ہیں ۔ بلا شبہ اگر اس میں شیر جیسی ہمت نہ ہوتی اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے پرہیز نہ کرتا اور لہو و لعب سے الگ رہ کر تدبیر مملکت کی طرف توجہ نہ دیتا تو وہ کبھی اتنی بڑی مملکت کی تاسیس کے فرض سے عہدہ بر آ نہ ہو سکتا کہ بعد والوں کو مضبوط اور مستحکم بنی بنائی مملکت مل گئی جنہیں صرف اس کی ضرورت ہی رہ گئی تھی کہ جو کچھ انہیں وراثت میں مل گیا تھا اس کی حفاظت کریں ۔

منصور نے ملک کو ایک وحدت کی شکل میں اپنے جانشین کے حوالے کیا جس سے اندلس کے سوا کوئی علاقہ باہر نہیں تھا ۔ مملکت میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا جس میں کہیں کوئی بڑے فتنے نہیں تھے ۔ خزانے مال و دولت سے بھرپور تھے ۔ سکانِ مملکت میں سے عربوں کے اثرات کم ہونے شروع ہو چکے تھے ۔ ان کا اثر و نفوذ بہت کمزور ہو چکا تھا ۔ موالی اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ہر شعبۂ زندگی سے انہیں باہر کر دیں اور جزیرہ نمائے عرب میں انہیں دھکیل دیں ۔ جیسا کہ وہ بدویانہ زندگی کے دور میں جاہلیت کے زمانہ میں تھے ۔ وہ برابر کوشش کرتے رہے تھے کہ عربی عادات و رسوم کی جگہ ایرانی عادات و رسوم لے لیں اور عربی زندگی کی سادگی کی جگہ متمدن زندگی کی پیچیدگیاں چھا جائیں ۔ بہرحال وہ دوسرا دور آیا جس میں خلیفہ اور لوگوں کو اس کا وقت ملا کہ وہ فراغت اور عیش و عشرت کی سوچ سکیں ۔ یہ دور ترفہ و تنعم کے لئے بہت زرخیز سرچشمہ ثابت ہوا ۔

مہدی

منصور کی موت کے بعد لوگ کسی حد تک راحت محسوس کرنے لگے تھے ۔ منصور کے زمانہ میں لوگ ان مشقتوں سے تھک چکے تھے جو ایک مملکت کی تاسیس کے لئے ضروری ہوتی ہیں جس کے لئے بڑی بڑی دشواریوں پر قابو پانا ہوتا ہے ۔ اس میانہ روی اور کوشش پیہم سے لوگ اکتا گئے تھے جو منصور کا خصوصی جوہر تھا ۔ وہ ایسی زندگی کے متلاشی تھے جس میں مالی وسعت اور آرام و آسائش کی گنجائش نکل سکے ۔ یہ بات انہیں خلیفہ "مہدی" میں ملی ۔ واقعہ یہ ہے کہ مہدی کا دس سالہ دورِ حکومت وہ درمیانی پل تھا جس کے ایک طرف منصور کے عہد کی محنت و مشقت ، تنگی اور خشکی اور عملی جد و جہد کی زندگی تھی اور دوسری طرف ہارون رشید اور اس کے جانشینوں کے دور کی ترفہ اور تنعم کی زندگی تھی ۔

مہدی سخی اور فراخ دست خلیفہ تھا ۔ لوگوں کو منصور کی بخیلی سے ذرا سانس لینا میسر آیا ۔ منصور اپنے بعد چودہ ملین دینار اور چھ سو ملین درہم چھوڑ گیا تھا[1] ۔ مہدی نے یہ تمام دولت لوگوں میں تقسیم کر دی ۔ علاوہ ازیں جو دولت خود اس کے زمانہ میں حاصل ہوئی وہ اسے بھی تقسیم کرتا رہا ۔ دولت کی فراوانی ... ہر قوم اور ہر عہد میں ___ ترفہ و تنعم اور لہو و لعب کا سبب رہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ سخاوت کا معیاری اندازہ اس سے بلند تر کرنے لگے تھے ۔ وہ مہدی کے زمانہ میں بخیلوں کے پُر لطائف قصے کہانیاں بیان کرتے تھے ۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ امام جاحظ نے ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھ دی جس کا نام ہی کتاب "البخلاء" ہے ۔

---

[1] مسعودی صفحہ ۱۴۶ جلد ۲ ۔

مہدی میں فنونِ لطیفہ سے محبت اور سخاوت کی طرف شدید میلان دونوں باتیں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ لوگ ان دونوں فنوں میں اس کی پیروی کرتے تھے اور اہلِ فن پر گراں قدر اموال خرچ کرتے تھے جس سے فن کو ترقی ہوئی تھی اور وہ معاشرہ کے مختلف طبقوں میں پھیلنے لگا تھا۔ مہدی نے گویوں کے گانے سننے کے لئے مجلسیں آراستہ کر کے بیٹھنا شروع کر دیا تھا جب کہ اس کا باپ منصور ان گانوں پر حدی خوانی کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اغانی کا بیان ہے کہ مہدی سب گویوں کا گانا سنتا تھا۔[1] یہ اس کی مجلس میں حاضر ہوتے اور پردہ کے پیچھے سے گانا سناتے تھے۔ گویّے مہدی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ البتہ فلیح ابن ابی العوراء کو ایک مرتبہ مہدی نے اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کی مجلس میں حاضر ہو کر دو شعر سنائے۔ فلیح کو خود مہدی کے اہل اور موالی کے درمیان حاضر ہونے کی اجازت دی گئی تھی۔ چنانچہ فلیح وہ پہلا شخص تھا جس نے مجلس میں مہدی کا چہرہ دیکھا۔[2] کتاب "اخلاق الملوک" کے مصنف کا بیان ہے کہ منصور کی پیروی میں ابتدائی ایک سال تک مہدی اپنے ندیموں سے پردہ میں رہا پھر اس کے بعد اس نے یہ پابندی ختم کر دی تھی تو ابو عون نے مشورہ دیا کہ ندیموں سے پردہ ہی میں رہنا چاہئے۔ مگر مہدی نے ناگواری کے ساتھ اس مشورہ کو رد کر دیا اور کہا "ہٹو! تم بالکل ہی جاہل ہو۔ سرور کو مشاہدہ کرنے اور اس سے قریب بیٹھنے ہی میں لذت ہے جو مجھے خوش کر سکے۔ دور دور۔ اس میں کیا بھلائی اور لذت ہو سکتی ہے"[3] اپنے باپ کے برعکس وہ لوگوں کو گانے پر بے دریغ مال بھی دیتا تھا۔ منصور اپنے ندیموں وغیرہ میں سے کسی کو کبھی ایک درہم بھی نہیں دیتا تھا اور نہ اس نے کسی ایسے آدمی کو جو لہو و لعب، ہنسی دل لگی یا ہزل گوئی کا کام کرتا ہو کبھی ایک چپہ بھر زمین بھی جاگیر میں دی۔ لیکن مہدی بہت زیادہ عطایا بخشنے والا تھا۔ وہ مسلسل دیتا رہتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی اس کے سامنے حاضر ہوا اور اس نے اسے بے نیاز نہ کر دیا ہو۔[4] مہدی نے اسی پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے قصر شاہی میں اپنے دونوں بچوں، ابراہیم ابن المہدی اور علیّہ بنت المہدی کے لئے گانے بجانے، اور خوش مذاقی کے سلسلہ میں دنیا کی ساری زینتیں اور اپنے وقت کی تمام لذتیں مہیا کر رکھی تھیں۔

مہدی کو باندیوں سے بھی انس تھا۔ عورتوں کے متعلق باتیں کرنے کو بغیر کسی تکلف اور جھجک کے وہ پسند کرتا تھا۔ جاحظ کا بیان ہے کہ "مہدی گانے والی باندیوں کو پسند کرتا اور گانا سنتا تھا۔ اسے ایک باندی بہت ہی پسند تھی جس کا نام "جوہر" تھا۔ اسے اس نے مروان شامی سے خریدا تھا۔ مہدی نے اس باندی کے سلسلہ میں کچھ اشعار بھی کہے ہیں"[5]

صاحب اغانی اور طبری دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ مہدی شراب نہیں پیتا تھا لیکن اس نے ابو جعفر منصور کے بعد اس سلسلہ میں ایک قدم ضرور آگے بڑھایا تھا۔ ہم منصور کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ نہ وہ شراب پیتا تھا اور نہ کسی کو اس کی اجازت دیتا تھا کہ وہ دستر خوان پر شراب پی سکے۔ لیکن مہدی کے متعلق طبری کا بیان ہے کہ وہ خود شراب نہیں پیتا تھا۔ لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسے بری چیز سمجھتا تھا بلکہ اسے اس کی کبھی خواہش ہی نہیں ہوئی۔ اس کے اصحاب اس کے پاس بیٹھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے شراب پیتے تھے۔ مہدی کا وزیر یعقوب بن داؤد اس سلسلہ میں اسے نصیحت کرتا تھا اور باصرار اسے مجبور کرتا تھا کہ گانا سننا اور شراب پلانا بند کر دے۔ آخر تو اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر مہدی نے یہ باتیں نہ چھوڑیں تو وہ اپنے منصب سے الگ ہو جائے گا۔ لیکن مہدی اس کے جواب میں یہ دلیل دیا کرتا تھا کہ آخر عبد اللہ ابن جعفر بھی تو گانا سنا کرتے تھے[6]

---

[1] اغانی صفحہ ۹۹ جلد ۴ ۔ [2] اخلاق الملوک صفحہ ۳۴ ۔ [3] اخلاق الملوک صفحہ ۳۴-۳۵ ۔
[4] البیان التبیین صفحہ ۲۰۸ جلد ۳ ۔ [5] اغانی صفحہ ۵ جلد ۵ ۔ و طبری صفحہ ۲۰ جلد ۱۰ ۔

مہدی اپنے کھانے اور پینے ہی میں فضول خرچ تھا حج کے لیے جاتا تھا تو برف بغداد تک سے پہنچائی جاتی تھی ۔ مہدی پہلا خلیفہ تھا جس نے ایسا کیا ۔

یہ حقیقت ہے کہ مہدی ــــ جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے ۔ اپنے لہو و لعب اور ترفہ و تنعم میں اعتدال سے آگے نہیں بڑھتا تھا ۔ لیکن اسے لوگوں کے لیے بھی اس سلسلہ میں باگ اتنی ڈھیلی نہیں چھوڑنی چاہئے تھی کہ وہ اسے اچھی چیز سمجھنے لگیں ۔ رند مشرب لوگ افراط کی حد تک پہنچ گئے تھے اور چھوٹ ہو چلے تھے ۔ منصور کے عہد حکومت میں لوگوں کو اس رندی کی جرأت اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ خود منصور نے ان کے سامنے اپنا نمونہ حقیقت پسندانہ اعتدال پر رکھا ہوا تھا ۔ جب لوگوں نے مہدی کو دیکھا کہ وہ لہو و لعب کی طرف دو چار قدم بڑھا رہا ہے تو لوگوں کو جرأت ہوئی اور انہوں نے دوڑنا شروع کر دیا ۔ مہدی کے عہد میں بشار کی عریاں گوئی اور فحش نگاری نے بڑے لوگوں کو برے ہی فتنہ میں مبتلا کر دیا تھا ۔ اور پورے ملک کو اس فحاشی اور عریانی کا شکار رہنا پڑا تھا ۔ حتیٰ کہ اشراف اس کے اشعار سے تنگ آ کر مہدی کے پاس حاضر ہوئے ۔ ان اشراف میں خود مہدی کے ماموں یزید بن منصور جیسے حضرات بھی شامل تھے ۔ انہوں نے مہدی سے درخواست کی کہ وہ اس فحاش کی زبان کو لگام دے ورنہ انہیں اندیشہ ہے کہ ان کی عورتیں اور لڑکیاں خراب ہو جائیں گی ۔ بالآخر مہدی نے مداخلت کی اور بشار کو غزل گوئی کی ممانعت کر دی ۔ بشار کہتا ہے ۔

> میں نے ایک عمدہ مجلس کے زیر سایہ پہلوؤں ، شراب اور باجوں گاجوں کے درمیان زندگی گزاری ہے ۔ میں نے خضفور سے لے کر قیروان اور یمن تک سارے شہروں کو ایسے اشعار سے بھر دیا ہے جن کے لیے کنواری لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں اس طرح نمازیں پڑھتی ہیں جس طرح گمراہ لوگ بتوں کے لیے نمازیں پڑھتے ہیں ۔ مگر پھر مجھے مہدی نے منع کر دیا تو میرا دل اسی طرح پلٹ گیا جس طرح ایک مطیع و فرمانبردار آدمی پلٹ جاتا ہے ۔ اس خدا کا شکر ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور جس کے سوا زمانہ میں کوئی چیز باقی رہنے والی نہیں ۔

لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خباثت سے باز نہیں آیا ۔ وہ کھلم کھلا تو نہیں چھپ چھپ کر ان مضامین کو بیان کرتا اور مہدی کی ممانعت کے پردہ میں اپنی حفاظت و معذرت کرتا تھا ۔ وہ کہتا ہے ۔

> اف ! وہ حسین منظر جو میں نے ایک باندی کے چہرہ میں دیکھا ۔ میری جان اس پر قربان ۔ اس نے میرے پاس اپنی جوانی کے لباس کا سودا کرنے کے لیے آدمی بھیجا ۔ میں نے اس کے اس لباس کو لپیٹ دیا ۔ محمد کے پروردگار اللہ کی قسم میں نے نہ عہد شکنی کی اور نہ اس کا ارادہ کیا ۔ میں اس سے رکا رہا لیکن بسا اوقات ایسی آزمائش آ پڑتی ہے جس کا میں طلب گار بھی نہیں ہوتا ۔ خلیفہ نے مجھے منع کر دیا ہے اور جب وہ منع کر دیتا ہے تو میں اس سے رک جایا کرتا ہوں ۔ مجھے عظیم بادشاہ نے عورتوں سے روک دیا ہے اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا ۔ بلکہ اس کے حکم کو بجا لاتا ہوں اور جو وعدہ کر چکا ہوں اسے ضائع نہیں کرتا ۔ میں دشمنوں پہ ہر وقت متوجہ رہتا ہوں اور جب تلوار گراں ہو جاتی ہے تو اسے خرید لیا کرتا ہوں ۔ شرم کی وجہ سے میں ہم نشین کی انسیت میں پورا پورا میلان رکھتا ہوں ۔ مگر اس کی اشتہا نہیں رکھتا ۔ محبوب کا گھر مجھے اپنی طرف جب میں صبح کو جاتا ہوں شوق کے ساتھ کھینچتا ہے ۔ اور کہاں ہے اس کا گھر ؟ خلیفہ کا حکم اس کے گھر کے درمیان حائل ہو گیا ہے ۔ میں اس سے صبر تو کرتا ہوں مگر اسے ناپسند نہیں کرتا ۔

اور وہ کہتا ہے :-

میں نے زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنی محبت کو دفن کر دیا ہے چنانچہ جب تک قمریاں بولتی رہیں گی میں سلیمیٰ اور صفراء سے ملنے کے لئے نہیں جاؤں گا۔ مہدی کی وجہ سے میں نے ان کے وصال کو چھوڑ دیا ہے اور اس عہد کا لحاظ کرتا ہوں جو ہمارے درمیان ہوا ہے اور جو فریب نہیں ہے۔ اگر امیرالمومنین محمد (مہدی) نہ ہوتے تو میں ضرور اس کا منہ چوم لیتا بلکہ یقیناً اپنا روزہ ہی اس سے افطار کرتا لیکن میری زندگی کی قسم میں نے تو اپنے نفس کو گناہوں سے لاد رکھا ہے۔ اب میں بوجھ پر مزید بوجھ بڑھانے والا نہیں ہوں۔

اس کے بعد مہدی کو ابراہیم موصلی کی خوش آوازی کی شہرت معلوم ہوتی ہے تو وہ اسے اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔ مہدی ہی پہلا شخص ہے جس نے ابراہیم موصلی شان کو بلند کیا اس کے بعد مہدی کو معلوم ہوا کہ موصلی شراب پیتا اور رندانہ باتیں کہتا ہے مہدی چاہتا تھا کہ برابر اس کے ساتھ رہے اور اپنی رندانہ باتیں چھوڑ دے۔ لیکن موصلی کے بس کی یہ بات نہیں تھی۔ مہدی سے مارتا ہے اور قید کر دیتا ہے۔ ابراہیم موصلی کا بیان ہے کہ مجھے مہدی نے ایک دن بلایا اور لوگوں کے گھروں پر جا کر شراب پینے اور ان کے ساتھ رندی کرتے پر بڑی ملامت کی تو میں نے عرض کیا کہ اے امیرالمومنین! میں نے یہ فن اس لئے سیکھا ہے کہ اس سے لذت حاصل کروں اور اپنے دوستوں کے ساتھ عیش و عشرت کی داد دوں۔ اگر میرے لئے ان تمام باتوں کا چھوڑنا ممکن ہوتا جن میں گرفتار ہوں تو محض خدا کی خاطر میں ان کو کبھی کا چھوڑ چکا ہوتا۔ مہدی کو میرے اس جواب پر بہت سخت غصہ آیا اور وہ کہنے لگا۔ بہت اچھا مگر خبردار تم موسیٰ اور ہارون کے پاس آئندہ سے کبھی نہیں جاؤ گے بخدا کی قسم اگر تو ان کے پاس گیا تو سمجھ رکھنا کہ میں کیا کچھ کروں گا۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے یہ بات منظور ہے مگر چند ہی دن کے بعد مہدی کو اطلاع مل گئی کہ میں ان دونوں کے پاس گیا اور ان کے ساتھ میں نے شراب پی۔ یہ دونوں شراب کے متوالے تھے۔ مہدی نے اس جرم میں مجھے تین سو کوڑے لگوائے اور قید کر دیا[1]۔

درحقیقت مہدی نے لوگوں کے لئے لہو و لعب کا دروازہ کھول دیا۔ پھر اس کی کوشش کی کہ وہ حد کے اندر رہیں، حد سے آگے نہ بڑھیں۔ مگر لوگ حدود کو پھاند کر آگے بڑھ چکے تھے۔ اس کے بعد مہدی نے بڑی کوشش کی کہ سزائیں دے دے کر لوگوں کو اس حد کے اندر رہنے پر مجبور کرے جو اس نے ان کے لئے مقرر کی تھی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

ہارون رشید

ہارون رشید کے زمانہ میں لوگوں نے عیش و عشرت کے اندر اسراف میں ایک قدم اور آگے بڑھایا جس کے چند اسباب تھے۔ ان میں کچھ تو وہ باتیں تھیں جن کا تعلق اُمت کے طبعی نشو و نما سے تھا۔ حکومت کے حالات منظم ہو جانے کی وجہ سے مملکت کی ثروت میں اضافہ ہو گیا تھا اور اسے یہ قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکے۔ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ ہارون رشید کے عہد حکومت میں مملکت کی آمدنی سات ہزار پانچ سو قنطار سالانہ تھی[2] اور قنطار ان کے حساب میں دس ہزار دینار کہلاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجموعی آمدنی ستر ملین ایک لاکھ پچاس ہزار دینار سالانہ تھی۔ یہ میزانیہ بہت ہی بڑا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ مملکت کی دولت اس کے عہد میں

---

[1] اغانی صفحہ ۵ جلد ۵　　[2] مقدمہ صفحہ ۱۰۱

کس قدر بڑھ گئی تھی اور عیش و عشرت کی زندگی گذارنے پر اسے کس قدر قدرت حاصل ہو چکی تھی۔

دوسرا سبب اس کے عہد میں ایرانیوں کے تسلط کا بڑھ جانا تھا۔ جن میں سب سے آگے آگے برامکہ تھے۔ ایرانی قوم شروع ہی لہو و لعب خوشی اور سرود، شراب کی پسندیدگی میں افراط کی طرف مائل رہی ہے۔ دینِ زردشتی میں شراب حلال تھی جو اسے دینی شعائر میں جگہ دیتی تھی۔ پروفیسر براؤن کے قول کے مطابق شراب آج تک زردشتی پارسیوں کی روزانہ کی زندگی میں نمایاں چلی آئی ہے ——— ایرانی پرانے زمانہ سے شراب پینے اور گانا سننے میں افراط سے کام لیتے آئے تھے۔ اچھے اور برے کھیلوں کے بہت سے فنون میں وہ افراط کے عادی تھے۔ دولتِ عباسیہ میں جب ان کا تسلط بڑھا خصوصیت کے ساتھ ہارون رشید اور مامون کے عہد میں تو انہوں نے اپنے اثر و نفوذ کے ساتھ اکاسرہ کا طرزِ زندگی اور ان کی تہذیب اور لہو و لعب کی چیزیں پھیلا دیں ——— اپنی حقیقت شناسی کے ماتحت انہوں نے نظمِ سیاسی پیدا کیا تو ساتھ ہی اپنی لہو آمیزی کے ماتحت شراب، گانے کی محفلیں، اقوال کی مجلسیں وغیرہ بھی پھیلا دیں۔

تیسری وجہ خود ہارون رشید کی طبیعت اور اس کی تربیت سے تعلق رکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہارون رشید ایک تیز طبع نوجوان تھا۔ لیکن اس قسم کا نہیں کہ خود کو بالکل ہی شہواتِ نفسانیہ کے حوالہ کر دے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا دل قوی اور طبعاً اور تربیت کے ماتحت بھی وہ ایک فوجی آدمی تھا۔ اکثر مشرق و مغرب میں اس نے فوجوں کی کمان کی تھی ——— طبیعت کی اس تیزی، دل کی قوت اور شباب کی سرسبزی و شادابی نے مل کر اس کی شخصیت کو مختلف کیفیات کا مظہر بنا دیا تھا۔ اسے نصیحت کی جاتی تھی تو وہ نصیحت سے متاثر ہوتا حتیٰ کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔ گانا سنتا تو اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا۔ ابراہیم موصلی سے گانا سنتا، برصوم سے بانسری سنتا اور زلزل سے طبلہ سنتا۔ بعض مرتبہ جوشِ طرب میں ایسی باتیں بھی اس کے منہ سے نکل جاتیں جن سے دینی تقویٰ سے بے احتیاطی کی بو آتی۔ وہ کہہ دیتا "اے آدم! اگر تم دیکھتے کہ آج تمہاری اولاد میں سے میرے سامنے کون کون لوگ حاضرِ دربار ہیں تو تم کتنا خوش ہوتے" بعد میں اپنی ان باتوں پر نادم بھی ہوتا اور استغفر اللہ پڑھتا ——— اس میں ایک طرف دینی رجحان بھی بڑھا ہوا تھا، مگر دوسری طرف فنونِ لطیفہ کا رجحان بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ نمازیں پڑھتا اور بہت نمازیں پڑھتا۔ گانے سنتا اور خوب خوب سنتا۔ اشعار سنتا اور ان سے لطف لیتا۔ اس کے میلانات و رجحانات مختلف اطراف کی طرف چلتے تھے اور وہ ہر جہت میں آخری حد تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ ابو العتاہیہ سے یہ اشعار سنتا:-

اے بے صبرے دل! اٹھتی ہوئی آنکھیں تجھ سے خیانت کر رہی ہیں خیر اور شر کے داعیے قریب بھی ہوتے ہیں اور دور بھی چلے جاتے ہیں۔ کیا ایسے آدمی کے لئے جس کی گناہوں میں تلاش ہو رہی ہو سچی توبہ ہو سکتی ہے؟ دلوں کی اصلاح کس طرح کی جائے۔ وہ تو زخم ہی زخم ہیں خدا ہمارے ساتھ احسان کا سلوک فرمائے ورنہ گناہوں سے تو کوئی خوشبو نہیں آیا کرتی۔ آدمی ایک دن ایسا جسم بن جائے گا جس میں جان نہیں ہوگی۔ ہر زندہ آدمی کی آنکھوں کے درمیان موت کا جھنڈا نظر آتا ہے۔ ہم سب غفلت میں گرفتار ہیں۔ اور موت صبح و شام آتی جاتی رہتی ہے۔ دنیا والوں کا دنیا سے حصہ اتنا ہی ہے کہ وہ صبح کو اور شام کو کچھ کھا پی لیں۔ لوگ شام کو زرکار کپڑوں میں جاتے ہیں اور صبح کو ٹاٹ پہن کر آتے ہیں۔ زمانہ کی ہر سینگ مارنے والی چیز کے لئے سینگ مارنے کا ایک دن آتا ہے۔ اے مسکین اپنے آپ پر نوحہ پڑھ اگر تجھے نوحہ پڑھنا آتا ہے۔ تجھے ضرور موت آ کر رہے گی اور اگر تیری عمر بھی

ہو گئی تو نوح علیہ السلام بھی تو ہمیشہ زندہ نہیں رہے تھے۔

ہارون رشید نے یہ اشعار سُنے تو رونے لگا اور اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۱؎ برامکہ سے خوش ہوتا ہے تو انہیں حد سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے اور انہیں انتہائی مقرب بنا لیتا ہے۔ پھر وہ ان پر ناراض ہوتا ہے اور حاسدین اس کے رجحان کو اور بھی بھڑکاتے ہیں تو انہیں ایسی سخت سزا دیتا ہے کہ پناہ بخدا۔ اسے گانا پسند آتا ہے تو ابراہیم موصلی کو اس طرح مقرب بنا لیتا ہے جیسے علماء اور قضاۃ کو مقرب بناتا تھا۔ جب کوئی مغنی یا شاعر اس کے جذبِ پسندیدگی کو ابھار دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو پھر وہ کبھی نہیں پوچھتا تھا کہ اس نے کتنا مال خرچ کر دیا ہے۔ ہارون رشید کے بیان میں مجھے صاحب اغانی کا یہ جملہ بہت ہی پسند ہے جو اس کی شدتِ رجحان کی بہترین مصوری کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نصیحت کے وقت ہارون رشید بے تحاشا آنسو بہاتا تھا اور غیض و غضب کے وقت انتہائی درجہ کا بے رحم بن جاتا تھا۲؎ لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں، اگر آپ اسے انتہائی درجہ کا دین دار دیکھتے ہیں۔ وہ نمازیں پڑھتا ہے تو دن میں سو سو رکعتیں پڑھ ڈالتا ہے۔ اگر آپ کسی وقت اسے ناراض دیکھتے ہیں تو وہ بے تحاشا ایسی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر خون بہانے لگتا ہے جو بہرحال خون بہانے کے لائق نہیں ہوتیں۔ جوشِ طرب میں آتا ہے تو مستی اور طرب ناکی اس پر اور اس کے حواس پر پوری طرح قابض ہو جاتی ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو ایک آدمی میں بیک وقت جمع ہو سکتی ہیں اور اس کا تصور کچھ دشوار نہیں ہے۔

آپ کتاب الاغانی کا مطالعہ کیجئے تو اسے پڑھ کر بسا اوقات ہارون رشید کی جو تصویر آپ کے ذہن میں بنے گی وہ کچھ اس قسم کی ہو گی کہ وہ چوبیس گھنٹے لہو و لعب اور رقص و طرب میں گرفتار رہتا تھا۔ اسے گانا سُننے کے سوا کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا۔ ندیموں کے ساتھ گھلا ملا رہنا اور شعراء کو انعامات دینا ہی اس کا مشغلہ تھا۔ اس میں صاحب اغانی کا کوئی قصور نہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب تاریخ پر نہیں لکھی کہ وہ مختلف خلفاء کے ادوار کو بیان کر کے ان کی تمام حسنات و سیئات گنائیں اور پھر ان خلفاء کا درجہ متعین کریں۔ انہوں نے اپنی کتاب "گانوں" کے موضوع پر لکھی ہے۔ لہٰذا یہ طبعی چیز ہے کہ وہ اپنی کتاب میں اسی قسم کی باتیں بیان کرنے پر اکتفا کریں جن کا تعلق گانے کے فن سے ہو جیسا کہ نحاۃ اور اہل لغت کے طبقات کی کتابیں علماء پر محض لغوی اور نحوی زاویہ نظر ہی سے گفتگو کرتی ہیں۔ اگر قصور ہے تو ان پڑھنے والوں کا ہے جو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ گانا ہی ایک ایسے شخص کی مکمل مصوری کر دیتا ہے جس کی شخصیت مختلف رجحانات کا مجموعہ ہو۔

آپ ابن خلدون کو پڑھئے تو وہ محض حقیقت پسندانہ دینی جہت ہی سے اس کی مصوری کرنے پر اکتفا کر جاتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ ہارون رشید شراب نہیں پیتا تھا کیونکہ وہ علماء اور اولیاء اللہ کی صحبت میں رہتا، نمازوں اور دوسری عبادتوں کی بڑی پابندی کرتا۔ صبح کی نماز ہمیشہ اپنے وقت پر پڑھتا۔ ایک سال جہاد کرتا اور دوسرے سال حج کیا کرتا تھا۔ وہ ان باتوں سے استدلال کرتے ہیں کہ علم اور سادگی میں اس کا اپنا خاص مقام تھا کیونکہ سلف سے اس کا زمانہ کچھ زیادہ دُور نہیں تھا۔ اس کے درمیان اور اس کے دادا ابوجعفر منصور کے درمیان کوئی بڑا زمانہ نہیں گذر گیا تھا۔ ہارون رشید فقہائے عراق کے مذہب کے مطابق صرف نبیذ پیا کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے فتوے کافی مشہور ہیں۔ جہاں تک خاص شراب کا تعلق ہے تو ہارون رشید پر اس کی تہمت لگانے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں ان کمزور اور ضعیف تاریخی روایات کی پیروی نہیں کرنی چاہئے جن میں اس سے اس قسم کی باتیں منسوب کی گئی

۱؎ اغانی صفحہ ۱۸۷ جلد ۳ + ۲؎ اغانی صفحہ ۱۰۷ جلد ۴

ہیں۔ وہ ہرگز ایسا آدمی نہیں تھا کہ ایک حرام چیز کا جو پوری ملت کے نزدیک اکبر الکبائر میں سے تھی ارتکاب کر سکتا۔ پوری کی پوری قوم ان دنوں لباس اور زینت میں ترفہ و تنعم اور دوسری چیزوں کے ساتھ اسراف برتنے سے بہت دور تھی کیونکہ ان میں اب تک بدویانہ زندگی کی خشونت اور دین کی سادگی پائی جاتی تھی جس سے وہ جدا نہیں ہوئے تھے۔[1]

ہمیں ابن خلدون کے ساتھ اس امر میں اتفاق ہے کہ ہارون رشید نے شراب نہیں پی۔ اس کے متعلق مشہور یہی ہے کہ وہ نبیذ پیا کرتا تھا۔ لیکن ہم اس نتیجہ سے اتفاق نہیں کرتے جو وہ آخر میں نکالتے ہیں کہ ترفہ و تنعم میں اسراف برتنے سے وہ بہت دور تھا اور یہ کہ اس کی زندگی بالکل سادہ تھی۔ اور یہ کہ وہ ایک حرام چیز کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ نتائج نکالنا محض ہارون رشید کو مقدس بنانے میں افراط سے کام لینے کے مرادف ہے جس پر خود ہارون رشید کی سیرت بھی دلالت نہیں کرتی۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ ابن خلدون نے اس سلسلہ میں جو دلائل دیئے ہیں وہ محض واعظانہ اور خطیبانہ دلائل ہیں۔ منصور سے اس کا قریب العہد ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کی زندگی بھی منصور ہی کی طرح ہو۔ خود ابن خلدون نے بارہا اس کی تصریح کی ہے کہ ہارون رشید کے زمانہ میں ترفہ اور تنعم منصور کے زمانہ کے مقابلہ میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اگر قریب العہد ہونا ہی استدلال کرنے کے لئے کافی ہوا کرے تو ہمیں "امین" میں — جو ہارون رشید سے قریب العہد ہے یہ بات کیوں نظر نہیں آتی کہ وہ ہارون رشید کی سیرت کے مطابق زندگی گزارتا۔

تعجب ہے کہ خود ابن خلدون نے لمبی لمبی فصلوں میں ہارون رشید، امین اور مامون کے عہد میں تہذیب و تمدن اور ترفہ و تنعم کی تفصیلات اور کھانے پینے اور پہننے میں ان کی جدت آرائیاں بیان کی ہیں اور خود ابن خلدون کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے مسعودی اور طبری سے ان حکایات کو بیان کرنے میں اتفاق کیا ہے جو مثلاً بوران بنت حسن کے ساتھ مامون کی شادی میں پیش آئیں کہ مامون نے اسے شب زفاف میں مہر کے طور پر یاقوت کے ایک ہزار ٹکڑے دیئے تھے اور عنبر کی شمعیں روشن کی تھیں اور ہر شمع میں ایک سو من (یعنی دو سو رطل عنبر تھا) اور اس کے لئے ایک فرش بچھایا گیا تھا جو بوریے کی طرح سونے کے تاروں سے بُنا گیا تھا اور اس میں جگہ جگہ موتی اور یاقوت ٹکے ہوئے تھے[2] الخ الخ

کیا یہ ترفہ و تنعم میں اسراف نہیں تھا؟ اور مامون کا زمانہ ہارون رشید سے اتنا ہی قریب نہیں تھا جتنا ہارون رشید کا زمانہ منصور سے تھا۔ جس کی وجہ سے ابن خلدون کے نزدیک لوگوں کو سادہ زندگی بسر کرنی چاہئے تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ ابن خلدون نے ہارون رشید کے عہد کو سادگی کا زمانہ کہہ کر اور یہ بتا کر کہ وہ اور اس کی قوم ترفہ و تنعم میں اسراف کرنے سے بہت دور تھی غلطی کی ہے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن خلدون نے ہارون رشید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے جہاں ایک پہلو کی یہ صحیح تصویر پیش کی ہے کہ وہ نمازیں پڑھتا تھا اور بڑا تقویٰ شعار تھا وہیں ساتھ ہی یہ نتیجہ نکالنے میں بڑی غلطی کی ہے کہ اس کے سارے پہلو ایسے ہی تھے۔ اس کی زندگی کا ایک پہلو وہ بھی تھا جسے صاحب اغانی نے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ہم صاحب اغانی کی طرح ابن خلدون کی طرف سے کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو ایک مؤرخ ہیں اور ان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایک شخص کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے دکھائیں۔ اگر ابن خلدون نے ہارون رشید کے ایک پہلو کو تشنہ چھوڑ دیا ہے تو وہ اس میں معذور قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

---

[1] یہ بحث تاریخ ابن خلدون کی جلد اوّل صفحہ ۳۰۱ پر ملاحظہ فرمائیے۔ [2] تاریخ ابن خلدون صفحہ ۳۴۵ جلد ا۔

غالباً ابن خلدون نے یہ سمجھا ہے کہ جو شخص رات کو سو سو رکعتیں نماز پڑھ سکتا ہے، جو فضیل بن عیاضؒ جیسے ولی اللہ کے ساتھ ہم نشینی کا شرف حاصل کرتا ہے اس سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ لہو و لعب کی مجلسیں آراستہ کر کے ان میں گانا بجانا سُنے اور ان مجلسوں میں ترفّہ و تنعّم کے مظاہر کا مکمل طریقہ سے مظاہرہ کرے۔ اگر ابن خلدون نے یہ سمجھا ہے تو بہت ہی غلط سمجھا ہے۔ انسانی طبیعت اس سے انکار نہیں کرتی۔

ہماری رائے یہ ہے کہ ہارون رشید حقیقت پسندانہ زندگی بسر کرتا تو اس میں گہرائی تک پہنچ جاتا۔ لہو و لعب میں مشغول ہوتا تو اس میں بھی انتہا تک پہنچ جاتا تھا۔ کیونکہ اس کی تیز طبیعت کے جو مختلف میلانات و رجحانات تھے وہ ان کے آگے سپر انداز ہو جاتا تھا۔

ابوالبختری وہب بن وہب قاضی کا بیان ہے کہ میں ایک روز ہارون رشید کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس نے برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی منگایا۔ ذخیرہ میں برف موجود نہیں تھی۔ ہارون رشید کو اس کی معذرت کے ساتھ ایسا پانی پیش کیا گیا جس میں برف نہیں تھی۔ ہارون رشید نے وہ پیالہ غلام کے منہ پر کھینچ کر مارا اور غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ میں نے عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! اگر جان کی امان ہو تو میں کچھ عرض کروں۔ ہارون نے کہا کہ کہو کیا کہتے ہو۔ میں نے عرض کیا۔ اے امیر المؤمنین! آپ دیکھ چکے ہیں کہ کل دوسروں کے ساتھ کیا ہو چکا ہے — جو امیہ کی حکومت کے زوال کی طرف اشارہ تھا — دنیا کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتی اور نہ ہی اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو ترفہ اور تنعّم کا اتنا عادی نہ بنائیں۔ آپ کو نرم اور سخت ہر قسم کی چیزیں کھانی چاہئیں، ملائم اور کھردرا ہر طرح کا لباس پہننا چاہیے۔ سرد اور گرم ہر طرح کی چیزیں پینی چاہئیں۔ ہارون نے مجھے اپنے ہاتھ سے تھپتھپایا اور کہا۔ خدا کی قسم میں اُدھر نہیں جا رہا ہوں جہاں تم مجھے لے جا رہے ہو۔ میں نرم و نازک چیزیں اُس وقت تک پہنتا ہوں جب تک ترفہ و تنعّم کی یہ چیزیں مجھے میسر ہیں۔ اگر مجھے زمانہ کی گردش پیش آئی تو میں اپنے اس دوسرے انداز کی طرف بغیر کسی جزع فزع کے لوٹ آؤں گا[1]۔

امین امین آیا تو اس نے لہو و لعب میں ایک قدم اور بڑھایا بلکہ چند قدم اور آگے بڑھ جاتے — محقق مؤرخین کہتے ہیں کہ امین کے متعلق زیادہ تر واقعات اس کی شہرت کو داغدار بنانے اور اس کی شان کو کم کرنے اور جو کچھ اس کے ساتھ کیا گیا اس کو درست ثابت کرنے کے لئے مامون کے زمانہ میں غلط طور پر گھڑے گئے ہیں۔ مگر لہو و لعب اور شراب و شباب میں افراط کی طرف اس کا میلان ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کا انکار کر دینا سہل ہو۔

طبری کا بیان ہے کہ جب محمد امین بادشاہ ہوا۔ تو اس نے ہیجڑے تلاش کر کر کے انہیں خریدا اور اُن کی بڑی بڑی قیمتیں دیں۔ اور انہیں رات دن خلوت میں اپنے ساتھ رکھا۔ اس کے کھانے پینے کے انتظامات اور راز و نہی سے متعلق معاملات سب انہی ہیجڑوں کے ہاتھ میں تھے۔ آزاد عورتوں اور باندیوں سے اسے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ لوگ امین کو ان ہیجڑوں کے ساتھ متہم کرنے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں کوئی شاعر کہتا ہے:۔

> اس کی عمر کا نصف حصہ تو ہیجڑوں کے لئے ہے اور باقی آدھا حصہ شراب پینے کے لئے۔ خوب صورت عورتوں کے لئے اس کے نزدیک کوئی حصہ نہیں سوائے منہ بنانے اور چہرہ پر شکنیں ڈال لینے کے۔ جب رئیس ایسا

---

[1] شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید۔ صفحہ ۱۲۲ جلد ۱

بمبارز و توڑئیں کے بعد ہم لوگوں کی تندرستی کی کس طرح امید کی جا سکتی ہے اگر دار الخلوص (وہ مقام جہاں رشید مدفون تھا) میں رہنے والے کو یہ معلوم ہو جائے تو اسے دار الخلوص میں رہنا مشکل ہو جائے [1]

طبری کا بیان ہے کہ امین نے بادشاہ ہو جانے کے بعد تمام شہروں سے تلاش کرا کر کے لہو و لعب کے فن کاروں کو جمع کیا۔ ہر وقت ان کو اپنے ساتھ رکھتا اور انہیں بیش قرار تنخواہیں دیتا اور طرح طرح کے عجیب و غریب حیوانات اور وحشی خطرناک جانور اور درندے اور پرندے و پنجرے خریدنے میں بیش قرار رقمیں خرچ کر ڈالیں۔ اپنے بھائیوں، گھر والوں، وزراء اور امراء سے دور دور رہتا۔ ان کی توہین کرتا۔ خزانوں میں جو کچھ زر و جواہر تھا سب اپنے ہیجڑوں، ہم نشینوں اور خوش گپیاں کرنے والوں میں تقسیم کر ڈالا۔ اپنی سیر و تفریح کے لئے کئی مکانات بنوائے۔ ان میں خلوت کی جگہیں کھیل کود کی جگہیں الگ الگ بنوائیں ——— دجلہ میں پانچ بڑے بڑے ستون بنوائے۔ ایک شیر کی صورت کا دوسرا ہاتھی کی صورت کا تیسرا عقاب کی صورت کا چوتھا سانپ کی صورت کا اور پانچواں گھوڑے کی صورت کا۔ ان کے بنوانے میں بے شمار دولت خرچ کر ڈالی۔ ان کے بارہ میں ابو نواس شاعر نے اپنے مدحیہ قصیدے کہے [2] ——— امین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اس کا وزیر فضل بن الربیع کہتا ہے کہ وہ ظربان (عود بلاؤ) کی طرح سوتا ہے اسے مال و دولت کے زوال کی کوئی فکر نہیں۔ کوئی رائے قائم کرنے یا کوئی تدبیر اور چال سوچنے میں اپنی فکر کو تکلیف دینا پسند ہی نہیں کرتا اسے اس کے جام و سبو نے غافل کر رکھا ہے وہ اپنے لہو و لعب کی تیزی سے دوڑا چلا جا رہا ہے اور زمانہ اس کی ہلاکت کے لئے گڑگڑا رہا ہے عبد اللہ مامون نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس نے اس کے لئے جلد میں نشانہ پر بیٹھنے والے تیر چڑھائے ہیں۔ مکان کی دوری کے باوجود اس پر موت کے تیر برسا رہا ہے اور گھوڑوں کی پشت پر اس کے لئے موتیں سوار کر کے بھیج رہا ہے۔ نیزوں اور تلواروں کی دھاریں اس نے اس کے لئے موت کی تیزیاں باندھ رکھی ہیں [3]

شمع خاموش

علامہ اقبالؒ نے ایسی روشنی کو جو کسی سے متعارف نہ ہو لیکن صحرا کی تاریک رات میں تنہا مسافروں کی راہ نمائی کا فریضہ سرانجام دے "قندیل رہبانی" کہہ کر پکارا تھا۔ تحریک طلوع اسلام کے دلشت نورد عمل کے لئے ایک ایسی ہی قندیل حکیم بخش عظیم (مرحوم) تھے جو سالہا سال سے نہایت خاموشی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ خاموش اور نام و نمود سے اس قدر مستغنی کہ وہ ادارے سے متعارف تک بھی نہ تھے۔ پڈ عیدن (سندھ) کے جان محمد صاحب نے یہ سوہان روح خبر دی ہے کہ عظیم صاحب ٹرین کے ایک حادثہ میں اچانک وفات پا گئے۔ ادارہ کو اس کا انتہائی صدمہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق۔

[1] طبری صفحہ ۲۱۵ جلد ۱۰ — [2] طبری صفحہ ۲۱۵ جلد ۱۰ — [3] طبری صفحہ ۱۵۷ جلد ۱۰

قرآنی فیصلے

(جلد پنجم)

طلوع اسلام کی مسلسل کاوش اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ افرادِ ملت نے اسلام کے متعلق غور و فکر سے کام لینا شروع کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دل میں مختلف قسم کے شکوک پیدا ہوئے اور اعتراضات ابھرنے لگے۔ یہ شکوک و اعتراض بیشتر اس اسلام کے پیدا کردہ تھے جو ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ یا اس تعلیم کے پیدا کردہ جو ہمارے سکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ طلوع اسلام نے اپنا فریضہ سمجھا کہ وہ ان شکوک کا ازالہ کرے اور ان اعتراضات کا جواب دے۔ چنانچہ طلوع اسلام کے پاس یہ سوالات آتے گئے اور یہ ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ اس قدر اہم تھا کہ ارباب فکر و نظر کے تقاضے کے پیش نظر اسے الگ کتابی شکل میں شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔

اس نہایت اہم اور مقبول سلسلہ کا نام ہے

قرآنی فیصلے

جس کی چار جلدیں پہلے شائع ہو چکی تھیں اور پانچویں جلد اب شائع ہوئی ہے۔ اس میں کئی متعدد سوالات اور ان کے اطمینان بخش جوابات آ گئے ہیں۔ تفصیل میں جانے کی تو گنجائش نہیں۔ اس کے ان ابواب پر ایک نگاہ ڈالئے۔

(۱) مذہبی پیشوائیت اور اسلام (۲) شرعی قوانین (۳) علماء کی باہمی پھوٹ (۴) تحریک پاکستان اور علماء حضرات (۵) مسائل نظام و نظام مصطفیٰ (۶) زکوٰۃ کا مفہوم اور نظام زکوٰۃ میں تبدیلیاں (۷) ارکان اسلام کے متعلق (۸) جنسیات (۹) تحفظ ناموس رسالت

ہر باب کے تحت بکثرت سوالات اور ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ ضخامت (پہلی چار جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی) ۵۱۲ صفحات۔ قیمت -/۳۰ روپے۔

(سابقہ جلدوں کی قیمت جلد اول -/۱۲ روپے۔ جلد دوم -/۲۰ روپے۔ جلد سوم -/۱۰ روپے۔ جلد چہارم -/۱۵ روپے۔ علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور ● (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور